عہد حاضر میں
اسلامی ریاست
اور
معیشت
کے چند بنیادی مسائل
ڈاکٹر اسرار احمد
مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

عہدِ حاضر میں

اسلامی ریاست اور معیشت

کے چند بنیادی مسائل

ڈاکٹر اسرار احمد

امیر تنظیم اسلامی، و داعیٔ تحریک خلافت پاکستان

شائع کردہ

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

36۔ کے، ماڈل ٹاؤن لاہور فون: 03-5869501

نام کتاب ـــــ عہد حاضر میں اسلامی ریاست اور معیشت کے چند بنیادی مسائل

بارِ اوّل (اگست ۲۰۰۲ء) ـــــ ۳۳۰۰

ناشر ـــــ ناظم نشر و اشاعت، مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور

مقام اشاعت ـــــ ۳۶۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور

فون: ۳۔۵۸۶۹۵۰۱

مطبع ـــــ شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور

قیمت ـــــ ۴۰ روپے

ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض ناشر

دور حاضر کی مثالی اسلامی ریاست کے حوالے سے بے شمار سوالات ذہنوں میں کلبلاتے ہیں۔مثلاً عصر حاضر کی اسلامی ریاست کا سیاسی ڈھانچہ کیا ہوگا' صدر یا امیر کا چناؤ کس طور پر ہو گا' سیاسی نظام صدارتی ہو گا یا پارلیمانی' فیڈرل ہو گا یا کنفیڈرل' —— پھر یہ کہ نظام معیشت کے نمایاں خدو خال کیا ہوں گے' —— اسلام کا معاشی نظام سوشلزم سے زیادہ قریب ہے یا کیپٹلزم سے مشابہہ ہے' وغیرہ۔اس معاملے میں ہمارے علماء کرام اور سکالرز بالعموم دو انتہاؤں پر کھڑے نظر آتے ہیں۔قدامت پسند علماء تمدنی ارتقاء کے نتیجے میں تشکیل پانے والے عصر حاضر کے سیاسی نظام کو سراسر کفر سمجھتے ہوئے اسلام کے سیاسی نظام کے ساتھ اسے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کو گمراہی تصور کرتے ہیں' جبکہ بعض ''روشن خیال'' دانشوروں کے نزدیک اسلام کا اپنا کوئی سیاسی نظام سرے سے موجود ہی نہیں ہے لہٰذا عصر حاضر میں جو نظام مغرب نے ایک طویل ارتقائی عمل کے نتیجے میں تشکیل دیا ہے' اسے من وعن اسلامی ریاست میں اختیار کیا جا سکتا ہے۔کچھ اسی طرح کا معاملہ معاشی نظام کا بھی ہے۔

محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے ان دو انتہاؤں کے مابین ایک معتدل موقف اختیار کیا ہے۔محترم ڈاکٹر صاحب کے نزدیک سیاسی نظام کے ضمن میں اسلام کے عطا کردہ اصول ہر اعتبار سے بالاتر ہوں گے' تاہم ان اصولوں کے تابع رہتے ہوئے اسلامی ریاست کے سیاسی ڈھانچے کی تشکیل میں عصر حاضر کے مروجہ سیاسی نظام سے استفادہ کرنے میں ہرگز کوئی قباحت نہیں ہے بلکہ دین وشریعت کے مزاج سے یہ چیز زیادہ مطابقت رکھنے والی ہے۔

اسلام کے معاشی نظام کے ضمن میں جہاں سود اور جوئے کی حرمت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے' وہاں اراضی کا منصفانہ بندوبست اور جاگیرداری نظام کا خاتمہ بھی نہایت بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔زیر نظر کتابچے میں شامل محترم ڈاکٹر صاحب کے مقالات ومضامین میں ان تمام اہم مباحث کا عمدگی سے احاطہ کیا گیا ہے' ہمیں امید ہے کہ وقت کے اہم ترین مسائل پر محترم ڈاکٹر صاحب کے خیالات وافکار پر مشتمل ان مضامین کو قارئین نہایت مفید پائیں گے۔

ناظم نشر واشاعت

یکم اگست ۲۰۰۲ء

جدید اسلامی ریاست کے اجزائے ترکیبی

جدید اسلامی ریاست کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں اور اس کے نمایاں خدوخال کون کون سے ہیں' اس بارے میں امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب بارہا اپنے خیالات کا اظہار فرما چکے ہیں' تحریری صورت میں بھی اور تقریری شکل میں بھی۔ لیکن ۷ نومبر کے ''نوائے وقت'' کے ادارتی کالم میں اداریہ نگار نے پاکستان کے قیام ہی کو اسلامی ریاست کی تشکیل کے مترادف قرار دیتے ہوئے محترم ڈاکٹر صاحب سے براہ راست یہ سوال کیا کہ اگر ان کے نزدیک پاکستان ابھی تک ''اسلامی ریاست'' نہیں بن سکا تو آخر اسلامی ریاست سے ان کی مراد کیا ہے! جدید اسلامی ریاست کی جو تعبیر نوائے وقت جیسے مؤقر روزنامے کے اداریہ نگار نے کی ہے اور نفاذِ اسلام کا جو مفہوم معین کیا ہے وہ باعث حیرت ہی نہیں باعث افسوس بھی ہے...... قارئین کی دلچسپی کے لئے اس اداریئے کا متعلقہ حصّہ اور اس کے بعد محترم ڈاکٹر صاحب کا وضاحتی مضمون جس کے ذریعے جدید اسلامی ریاست کے خدوخال اور اس کے اجزائے ترکیبی زیادہ نکھر کر سامنے آتے ہیں' دونوں پیش خدمت ہیں۔ (ادارہ)

روزنامہ ''نوائے وقت'' کا ۷ نومبر ۱۹۹۳ء کا اداریہ

تنظیم اسلامی کے امیر اور داعیٔ تحریک خلافت ڈاکٹر اسرار احمد نے اپنے خطبۂ جمعہ کے دوران اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ بلاشبہ مسلم لیگ ایک قومی جماعت تھی اور اس کا یہ بڑا احسان ہے کہ اس کی جدوجہد سے پاکستان بنا' لیکن یہ ملک ابھی تک اسلامی ریاست نہیں بن سکا' اس کے لئے ایک ایسی جماعت کی ضرورت ہے جس کے لوگ پہلے خود اپنی زندگیوں پر اسلام نافذ کریں اور پھر ملک میں اسلام کا نفاذ کریں۔ ڈاکٹر اسرار احمد سے بھی قوم یہ پوچھنے کا حق رکھتی ہے کہ آخر اسلامی ریاست سے ان کی مراد کیا ہے اور اس وقت پچاس سے زائد آزاد مسلم ممالک میں سے کونسا ملک ایسا ہے جسے ڈاکٹر صاحب اسلامی ریاست کا ماڈل قرار دے سکتے ہیں۔ شکر کی بات یہ

ہے کہ ڈاکٹر اسرار احمد نے یہ اعتراف کرلیا کہ مسلم لیگ نے ایک قومی جماعت کے طور پر تحریک پاکستان کو منطقی کامیابی سے ہمکنار کیا اور اپنے وقت کی دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت وجود میں آ گئی' لیکن ڈاکٹر صاحب ملک میں اسلام کے نفاذ کے لئے ایک ایسی جماعت کی ضرورت پر زور دے رہے ہیں جس کے ارکان پہلے اپنی زندگیوں پر اسلام نافذ کرسکیں۔ ڈاکٹر صاحب اگر وضاحت کر دیتے کہ آیا اس طرح کی جماعت سے ان کی مراد سابقہ جماعت اسلامی نہیں جس کے پلیٹ فارم سے خود انہوں نے اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلم لیگ کی تعریف و توصیف کے باوجود ڈاکٹر اسرار احمد کے لئے اس جماعت کو اسلامی کہنا مشکل ہو رہا ہے اور اس کا وہی مخصوص پس منظر ہے۔ جس کی وجہ سے جماعت اسلامی کی پوری قیادت اور برصغیر کی دیگر مذہبی شخصیات از قسم مولانا آزادؒ اور مولانا حسین احمد مدنیؒ نے مسلم لیگ اور قائداعظم کی مخالفت کی تھی۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے اپنی یہاں تک اصلاح کر لی ہے کہ "وہ مولانا مدنیؒ اور مولانا آزادؒ کے ایک مخصوص رنگ کی وجہ سے ان کے مداح رہے ہیں جبکہ انہوں نے ان صاحبان کی متحدہ قومیت کی کانگریسی سوچ سے لاتعلقی کا اظہار کیا ہے۔

ہم ڈاکٹر صاحب کو یاد دلانا چاہتے ہیں کہ پاکستان کی نئی نسل کے سامنے مولانا آزاد اور مولانا مدنی کا وہی ایک روپ ہے جو ان کی کانگریس کی غلامی اور کانگریسی ذہنیت کی عکاسی کرتا ہے۔ نئی نسل مولانا آزاد کو کانگریس کے صدر اور بھارتی حکومت کے ایک وزیر اور منتری کی حیثیت سے پہچانتی ہے اور مولانا مدنی نے جس طرح قومیت کے مسئلے پر حضرت علامہ اقبالؒ سے ''متھا'' لگایا اور جس طرح حضرت علامہ کو یہاں تک کہنا پڑا کہ ''از دیوبند حسین احمد' ایں چہ بوالعجبیست!''۔ مولانا مدنی انڈین نیشنلزم کے پرچارک تھے جبکہ حضرت علامہ کا فرمانا تھا کہ ''خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمیؐ''۔ وقت نے ثابت کر دیا کہ حضرت علامہ اور قائداعظم کا نظریہ قومیت علمائے دین کی ایسی برانڈ کے مقابلے میں درست ثابت ہوا اور پاکستان کا معرض وجود میں آنا ہی ایک اسلامی ریاست کی تشکیل کے مترادف ہے۔ یہاں ہم سے سوال کیا جاسکتا ہے کہ پاکستان کو اسلامی ریاست کیسے کہہ دیا تو اس کا سادا اور عام فہم جواب یہ ہے کہ جب پاکستان بنا اور اس کے ساتھ ساتھ دیگر مسلمان ممالک نے انگریز' فرانسیسی اور ولندیزی استعمار سے آزادی حاصل کی تو اس وقت تک دور حاضر کے تقاضے ہی بدل چکے تھے۔ مسلمان ممالک گزشتہ ایک ڈیڑھ صدی سے غلامی کی زندگی بسر کرتے رہے اور اس دوران میں ہماری سوچ جمود کا شکار رہی جبکہ اس عرصے میں دنیا میں تغیرات پیدا ہو چکے تھے۔ آج نصف صدی بعد آزاد مسلمان

ممالک کی تعداد بھی نصف صد سے تجاوز کر چکی ہے لیکن آج کی دنیا نئے انقلابات سے دوچار ہے اور دورِ حاضر کے علوم و فن اور تہذیب نے ایسا کمال حاصل کر لیا ہے کہ مسلمان ممالک کے لئے اس سے دوری بدقسمتی اور پسماندگی میں اضافہ ہی کر سکتی ہے اور کر رہی ہے۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، مسلمانوں کا ذہن بالکل واضح ہے اور عبادات اور اعتقادات سے روگردانی کو کوئی بھی جائز تصور نہیں کرتا لیکن دورِ حاضر سے ہم آہنگی بھی لابدی تصور کی جاتی ہے۔

اگر جماعت اسلامی کی دنیاوی حالت پر نظر ڈالی جائے تو پچھلے چار پانچ عشروں میں ایک انقلاب آ چکا ہے، آج جماعت کا ایئر کنڈیشنڈ ہیڈ کوارٹر جدید فن تعمیر کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ خود ڈاکٹر صاحب کے ہیڈ کوارٹر میں کس شے کی کمی ہے، اس کے بعد آخر اسلام کے نفاذ میں کہاں کمی دکھائی دیتی ہے۔ رہا موجودہ طرزِ سیاست تو ہر مذہبی جماعت اور اس کے رہنمایانِ کرام سیاسی عمل کی بدعت میں شریک ہیں، صدارت سے لے کر سینٹ، قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلی تک کے انتخابات میں حصہ بھی لیتے ہیں۔ یہ صورت حال اجماعِ اُمت پر دلالت کرتی ہے کہ موجودہ انتخابی عمل میں حصہ لینا کوئی غیر اسلامی یا قبیح فعل نہیں رہا۔ انتخابات کے ذریعے اسلامی ریاست کے عوام کاروبارِ مملکت چلانے کے لئے ایک سیاسی مشینری تشکیل دیتے ہیں جو اسلامی اصولوں کے مطابق اپنے فرائض کی انجام دہی کی پابند ہے۔ یہی ایک ماڈرن اسلامی، جمہوری، فلاحی، پارلیمانی ریاست کی تعریف ہو سکتی ہے اور اگر ڈاکٹر اسرار احمد یا قبلہ جنرل حمید گل کے ذہن میں اسلامی ریاست کا کوئی دوسرا تصور ہو یا انڈونیشیا، ملائشیا سے لے کر عرب امارات، سعودی عرب، مصر، شام، یمن، اردن، مراکش، تیونس، ترکی، لیبیا، نائیجریا تک کسی بھی ملک کو اسلامی ریاست کا ماڈل سمجھتے ہوں تو وہ اس کی نشاندہی فرما دیں تاکہ قوم کے ذہن سے کنفیوژن دور ہو سکے۔

مدیر نوائے وقت کی ادارتی تحریر کے جواب میں اصل موضوع یعنی جدید اسلامی ریاست کے دستوری خاکے سے متعلق کچھ عرض کرنے سے قبل تین تمہیدی باتیں عرض کرنا ضروری ہیں۔

پہلی یہ کہ اگر بقول ان کے ''پاکستان کا وجود میں آ جانا ہی ایک اسلامی ریاست کی تشکیل کے مترادف ہے'' تو پاکستان سے کہیں زیادہ بھاری مسلم اکثریت والے بیسیوں ملک جو اس سے قبل دنیا کے نقشے پر موجود تھے کس بنا پر ''اسلامی ریاست'' کی

تعریف سے خارج کئے جاسکتے ہیں؟ اور اگر آج جو نصف صد سے بھی زائد مسلمان ملک دنیا میں موجود ہیں‘ جن میں سے تیرہ کے نام تو خود انہوں نے بھی گنوا دیئے ہیں‘ سب کے سب اسلامی ریاست قرار پا سکتے ہیں تو کیا اس کا منطقی نتیجہ یہ نہیں ہوگا کہ ؏ ''شد پریشاں خوابِ من از کثرتِ تعبیر ہا!'' کے مطابق تسلیم کر لیا جائے کہ اسلامی ریاست کسی حقیقتِ واقعی کا نام ہے ہی نہیں!...... گویا ؏ ''کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا!''...... اور ؏ ''ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں!''۔

دوسری بات یہ کہ آج مسلمان تعداد میں سوا ارب سے زائد ہونے کے باوجود عالمی سطح پر ذلت اور مسکنت سے دوچار‘ اور اللہ تعالیٰ کے عذاب میں گرفتار اس بنا پر ہیں کہ پوری دنیا میں ایک ملک بھی ایسا نہیں ہے جسے اسلامی ریاست‘ معاشرت اور معیشت کا ''ماڈل'' قرار دیا جا سکے۔ چنانچہ ہم بحیثیتِ مجموعی اور بحیثیت امت مسلمہ اپنے فرض منصبی سے کوتاہی کے مرتکب ہو رہے ہیں‘ اور اپنے عمل کے ذریعے ؏ ''دے تو بھی محمدؐ کی صداقت کی گواہی!'' پر عمل پیرا ہونے اور اس طرح ''شہادت علی الناس'' کا فریضہ ادا کرنے کی بجائے ''کتمانِ حق'' یعنی حق کو چھپا لینے کے جرمِ عظیم کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ اور۔

''خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا!''

کے مصداق مسلمانوں کی موجودہ زبوں حالی کا کوئی علاج اس کے سوا موجود نہیں کہ دنیا کے کسی بھی گوشے میں یعنی کم از کم کسی ایک ملک میں اسلامی ریاست کا صحیح ''ماڈل'' پیش کر دیا جائے۔ تاکہ نوعِ انسانی دینِ حق کی برکتوں کا مشاہدہ چشمِ سر سے کر سکے اور اس طرح اس پر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی جانب سے اتمامِ حجت ہو جائے۔

تیسری بات یہ کہ فی الواقع اس مقصدِ عظیم کی خاطر پاکستان قائم ہوا ہے اور ان شاء اللہ العزیز ایک صحیح اسلامی ریاست کا ''ماڈل'' بننے کی سعادت اسی سرزمین کو حاصل ہوگی۔ چنانچہ مشیتِ ایزدی اور حکمتِ خداوندی اور گزشتہ چار سو سال کی تاریخ

سے قطع نظر، یہی بات جو مصور و مفکر پاکستان علامہ اقبال نے اپنے ۱۹۳۰ء کے خطبہ الٰہ آباد میں ارشاد فرمائی تھی......یعنی:

''میں محسوس کرتا ہوں کہ ہندوستان کے شمال مغربی علاقے میں ایک آزاد مسلم ریاست کا قیام تقدیر الٰہی ہے اور اگر ایسا ہو گیا تو ہمیں ایک موقع مل جائے گا کہ اسلام کی اصل تعلیمات کے چہرۂ روشن پر جو پردے عرب ملوکیت کے دور میں پڑ گئے تھے انہیں ہٹا کر اصل اسلام کی ایک جھلک نوعِ انسانی کو دکھا سکیں!''

اور یہی بات بانی و معمارِ پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح نے بھی فرمائی تھی کہ:

''ہم پاکستان اس لئے حاصل کرنا چاہتے ہیں کہ عہدِ حاضر میں اسلام کے اصولِ حریت و اخوت و مساوات کا ایک عملی نمونہ دنیا کے سامنے پیش کر سکیں!''

یہ دوسری بات ہے کہ چونکہ اُس وقت کے حالات میں حصولِ پاکستان کے لئے تحریک لامحالہ ''قومی'' بنیادوں پر ہی چلائی جا سکتی تھی لہٰذا ہر وہ شخص شریک اور شامل کر لیا گیا جو مسلمانوں کا سا نام رکھتا ہو، خواہ اس کا عمل اور کردار کیسا ہی ہو، لہٰذا قیامِ پاکستان کے بعد خود قائد اعظم کو کہنا پڑا کہ میری جیب میں سوائے کھوٹے سکوں کے اور کچھ نہیں ہے!......الغرض قیامِ پاکستان کو اگرچہ یقیناً اسلامیانِ ہند کی بہت بڑی کامیابی اور اللہ تعالیٰ کے بہت بڑے فضل و کرم کے مظہر ہونے کی حیثیت حاصل ہے، تاہم یہ ہمارے سفر کی صرف پہلی منزل ہے۔ اور ع ''وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے!'' کے مصداق سفر کا اصل اور زیادہ کٹھن مرحلہ ابھی سر کرنا ہے۔ اور اس کے لئے اگرچہ اصل ضرورت تو ایک ایسی جماعت کی ہے جو ایسے لوگوں پر مشتمل ہو جو اولاً خود اپنی ذات اور دائرۂ اختیار میں اسلام کو بالفعل نافذ کریں اور پھر نظامِ باطل کو بدلنے کے لئے نہ صرف یہ کہ تن من دھن وقف کر دیں، بلکہ جان ہتھیلی پر رکھ کر ایک مضبوط اور منظم جماعت کی صورت اختیار کر کے بالفعل ''حزب اللہ'' بن جائیں، تاہم اس کی پہلی اور کم از کم، اور قطعاً ناگزیر اور لازمی و لابدی شرط یہ ہے کہ اس حقیقت کو سمجھ اور مان لیا جائے کہ ع ''ز عشق تا بہ صبوری ہزار فرسنگ است!'' کے مصداق موجودہ جملہ مسلمان ممالک اور ایک ''حقیقی اسلامی ریاست'' میں زمین اور آسمان کا فرق ہے!

اب آیئے اصل موضوع کی طرف۔ ''جدید اسلامی ریاست'' کے عنوان سے از خود ظاہر ہے کہ ہماری مطلوب و مقصود اور زیر بحث و نظر ریاست میں دو اوصاف لازماً ہونے چاہئیں' یعنی ایک اسلام اور دوسرے جدیدیت! تو جہاں تک اسلام کا تعلق ہے' ہر شخص خواہ وہ خود بالفعل اسلام پر عمل پیرا ہو یا نہ ہو' جانتا ہے کہ اسلام نام ہے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی بے چون و چرا فرمانبرداری اور بلا استثناء اطاعت کا! لہٰذا اس کے بارے میں کسی مزید بحث و گفتگو اور قیل وقال کی ضرورت نہیں ہے!

البتہ ''جدیدیت'' سے مراد کیا ہے؟ اور اس کے کون سے اجزاء ہمارے لئے قابل قبول ہیں اور کون سے نہیں؟ اس معاملے کی اچھی طرح تحقیق و تفتیش اور بحث و تمحیص ضروری ہے۔ اس لئے کہ اصل ''کنفیوژن'' اسی معاملے میں پایا جاتا ہے۔ اور اگرچہ علامہ اقبال نے اصولی اعتبار سے تو بالکل بجا طور پر فرمایا ہے کہ۔

زمانہ ایک' حیات ایک' کائنات بھی ایک
دلیلِ کم نظری قصۂ قدیم و جدید!

تاہم واقعہ یہ ہے کہ یہ اصول صد فی صد یا تو صرف فرد اور اس کی نفسیات پر منطبق ہوتا ہے یا عمرانیات و اجتماعیاتِ انسانی کی صرف اوّلین اور اہم ترین منزل یعنی نظامِ معاشرت اور عائلی قوانین پر' جنہیں شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے ''تدبیرِ منزل'' سے تعبیر فرمایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بارے میں صرف اصول و مقاصد ہی نہیں تفصیلی قوانین بھی پورے شرح و بسط کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنے ابدی و سرمدی کلام میں بیان فرما دیئے جن کے بارے میں علامہ اقبال نے اپنے خطبۂ ششم میں بجا طور پر فرمایا ہے کہ مغرب سے مرعوب جدید ذہن ان کے ظاہری خد و خال میں الجھ کر رہ گیا ہے اور ان کی تہہ میں کار فرما حکمتوں تک رسائی حاصل نہیں کر سکا ـــــ بہر حال اس کے بالکل برعکس معاملہ ہے سیاست و ریاست کا' کہ ان کے ضمن میں کتاب وسنت میں صرف اصولی ہدایات پر اکتفا کی گئی ـــــ اور کوئی تفصیلی خاکہ یا ڈھانچہ نہیں دیا گیا۔ اس لئے کہ اس میدان میں نوعِ انسانی کے عمرانی ارتقاء کا سفر ابھی جاری تھا۔ چنانچہ نزولِ قرآن کے وقت ہی نہیں'

اس کے ایک ہزار سال بعد تک بھی ذہنِ انسانی پر یہ حقیقت منکشف نہیں ہو سکی کہ ''ریاست'' اور ''حکومت'' دو جدا چیزیں ہیں۔ اور حکومت کی حیثیت ریاست کے صرف انتظامی ادارے کی ہے اور شہریوں کی اصل وفاداری ریاست سے ہوتی ہے نہ کہ حکومت سے! اور حکومت کو تبدیل کرنے کی کوشش کرنا تو شہریوں کا بنیادی حق ہے۔ چنانچہ یہ اسی کا شاخسانہ تھا کہ حضرت حسین بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما' اگرچہ صرف حکومت کی اصلاح (یا تبدیلی) کے لئے اٹھے تھے لیکن ''حکومتِ وقت'' کے لئے انہیں ''باغی'' قرار دینا آسان ہو گیا۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ انہوں نے معاذ اللہ اسلامی ریاست کے خلاف علم بلند نہیں کیا تھا!

الغرض' سیاست اور ریاست کے میدان میں دو حقائق کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں ہے۔ ایک یہ کہ اس معاملے میں ہمیں کتاب و سنت سے صرف اصول لینے ہوں گے اور ان کے ساتھ عمرانی ارتقاء کے ثمرات میں سے جو کتاب و سنت کے منافی نہ ہوں انہیں لازماً شامل کرنا پڑے گا —— اور دوسری' اور قدرے تلخ حقیقت یہ کہ اس عمرانی ارتقاء میں ہم مسلمانوں کا کوئی حصہ نہیں ہے' یہ کُل کا کُل مغرب اور زیادہ معین طور پر یورپ میں ہوا ہے' تاہم یہ بات واضح طور پر سمجھ لینی چاہئے کہ یہ نوعِ انسانی کی مشترک متاع ہے' اور جس طرح ہم سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدانوں میں مغرب کی دریافتوں اور ایجادوں سے بھرپور طور پر مستفید ہو رہے ہیں' اسی طرح ہمیں اس کی عمرانی ترقی اور اس میدان میں ان کی ''یافت'' کے بارے میں بھی زیادہ حساس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگرچہ یہ فرق بہرحال ملحوظ رہے گا کہ طبعی سائنس پر مبنی ٹیکنالوجی کُل کی کُل ''مباحات'' میں شامل ہے (صرف اس کا غلط استعمال معصیت کا ذریعہ بن سکتا ہے۔) جبکہ عمرانی ارتقاء کے ثمرات کے ضمن میں ہمیں صحیح و غلط اور حلال و حرام کے مابین امتیاز بہرصورت کرنا ہوگا۔

(یہاں صرف برسبیلِ تذکرہ یہ اشارہ مناسب ہے کہ معاشیات اور اقتصادیات کا معاملہ ایک جانب معاشرت اور عائلی قوانین' اور دوسری جانب سیاست و ریاست کے

بین بین واقع ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے ضمن میں قرآن حکیم نے جہاں اصول و مقاصد بھی واضح کر دیئے ہیں' وہاں بعض معین احکام بھی دے دیئے ہیں' اگرچہ اتنے تفصیلی نہیں جتنے معاشرت اور ''تدبیرِ منزل'' کے ضمن میں!)

اس تمہید کے بعد آیئے اب دیکھیں کہ تصورِ ریاست و سیاست کے ضمن میں ''جدیدیت'' کن عناصر سے مرکب ہے۔ مختصر ترین اور سادہ ترین الفاظ میں بیان کیا جائے تو بع ''یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان'' کے مصداق ''جدیدیت'' بھی چار عناصر سے مرکب ہے' جن میں سے دو تو اسلام کی اساسی تعلیمات کے قطعاً منافی ہیں جن کا ترک واجب ہے' بقیہ دو میں سے بھی ایک وہ ہے جو تھا ہی اصلاً اسلام کی دین اور عطا' یہ دوسری بات ہے کہ مسلمانوں نے بہت جلد اپنے آپ کو اس سے محروم کر لیا تھا۔ البتہ دوسری (اور کُل تعداد کے اعتبار سے چوتھی) چیز وہ ہے جو کل کی کل مغرب کی ''یافت'' ہے جسے ہمیں اس کے شکریئے کے ساتھ قبول کر لینا چاہئے اور زیادہ گہرائی میں اتر کر دیکھا جائے تو وہ ہے بھی خالص تکنیکی نوعیت کی شے!

چنانچہ وہ دو عناصر جو دورِ حاضر کی ریاست اور سیاست کی رگ و پے میں زہرِ ہلاہل کی طرح سرایت کئے ہوئے ہیں اور جن کی اسلام کے ساتھ نہ صرف یہ کہ کوئی مناسبت نہیں ہے بلکہ وہ اسلام کی اساسی تعلیمات کی عین ''ضد'' اور کلی نفی کی حیثیت رکھتے ہیں' سیکولرزم اور نیشنلزم ہیں۔ اور ہم مسلمانانِ برعظیم پاک و ہند پر علامہ اقبال کے فکر اور فلسفے کی صورت میں اللہ تعالیٰ کا جو خصوصی فضل و کرم ہوا ہے' اس کے باعث ہم پر ان دونوں نظریات کا نوعِ انسانی کے حق میں زہرِ ہلاہل کی طرح مہلک اور اسلام کی اساسی تعلیمات کی عین ضد ہونا اتنا واضح اور مبرہن ہے کہ ان پر کسی گفتگو کی نہ صرف یہ کہ کوئی حاجت محسوس نہیں ہوتی بلکہ یہ قرطاس و قلم اور وقت و قوت کا خالص ضیاع نظر آتا ہے۔ تاہم صرف ضیافتِ طبع کے لئے سیکولرزم کی نفی کے لئے علامہ اقبال کے دو اشعار پیشِ خدمت ہیں جو اس ملحدانہ اور مشرکانہ تصور کے خلاف سیفِ قاطع کی حیثیت رکھتے ہیں...... یعنی ؎

ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی
ہوس کی امیری ' ہوس کی وزیری!

اور ؎

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

رہا نیشنلزم یعنی ''وطنی قومیت'' کا نظریہ تو اس پر تو ان کی مکمل نظم نہ صرف یہ کہ ''ضربِ حیدریؓ'' کی حیثیت رکھتی ہے بلکہ ایک جانب غالب کے اس مصرعے کی مصداقِ کامل ہے کہ ع ''عرض کیجے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں!'' تو دوسری جانب غالب کے بارے میں حضرت علامہ کے اپنے شعر یعنی ؎

''فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا!''

کی مصداقِ اَتم ہے۔ مزید برآں حضرت علامہ کی یہ نظم اس اعتبار سے بھی ''جوامع الکلم'' کی حیثیت رکھتی ہے کہ اس میں آغاز میں گفتگو خالص دینی اور اسلامی اعتبار سے ہوئی ہے۔ چنانچہ وطنی قومیت کے نظریئے کو عہدِ حاضر کے عظیم ترین ''شرک'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس لئے کہ اس کے زیر اثر وطن ایک ''معبود'' کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے' بمصداق ؎

اِن تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے!

اور اختتام پر گفتگو خالص انسانی سطح پر ہوئی ہے' یعنی ؎

اقوامِ جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے

اور ؎

خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے!

اور آخری شعر میں ان دونوں کو جمع کر لیا گیا ہے...... یعنی ۔

اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے!

الغرض' ہمیں جدید تصورِ ریاست کے ان دو عناصر کو تو ''جدید اسلامی ریاست'' کے تصور سے لازماً اور قطعی طور پر خارج کرنا ہوگا ہی' ان کے منطقی لوازم اور مضمنات کی بھی کامل بیخ کنی کرنی ہوگی۔

جدید تصورِ ریاست کا وہ عنصر جو حدیثِ نبویؐ: ''اَلْحِکْمَةُ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ '' کے مطابق مؤمن کی گمشدہ متاع کی حیثیت رکھتا ہے اس کا ''ری پبلکن'' مزاج ہے۔ چنانچہ علامہ اقبال نے اپنے ان دو اشعار میں بھی جو فصاحت و بلاغت کی انتہائی بلندیوں کو چھو رہے ہیں سب سے زیادہ اشارہ اسی حقیقت کی جانب کیا ہے کہ ۔

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو
آنکہ از خاکش بروید آرزو
یا زنورِ مصطفیٰؐ او را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰؐ ست!''
(فصلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلم!)

اور اپنے مشہور خطبات میں انہوں نے نہایت وضاحت کے ساتھ فرمایا ہے کہ:

''ری پبلکن طرزِ حکومت نہ صرف یہ کہ اسلام کی روح کے ساتھ کامل مطابقت رکھتا ہے بلکہ عالم اسلام میں جو نئے عوامل برسر کار ہو چکے ہیں ان کے پیشِ نظر ناگزیر بھی ہے''۔ (خطبۂ ششم)

اور اس کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت درکار ہے کہ خلافتِ راشدہ کا نظام نہ ملوکیت اور شہنشاہیت پر مبنی تھا' نہ برہمنیت اور پاپائیت پر۔ بلکہ الفاظ قرآنی ''اَمْـرُهُـمْ شُـوْرٰی بَیْـنَـهُـمْ '' کے مطابق اس کے جملہ معاملات مسلمانوں کے باہمی مشورے سے طے ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ گاندھی ایسے ہندو مہاتما کو بھی ۱۹۳۷ء میں جب پہلی بار ہندوستان میں صوبائی وزارتیں قائم ہوئیں تو کانگرسی وزراء کے سامنے قابل تقلید

مثالوں کی حیثیت سے صرف ابو بکرؓ اور عمرؓ کا نام لیتے ہیں۔ اس لئے کہ قدیم ہند کی تاریخ میں بکرما جیت ہوں یا اشوک' اور چندر گپت ہوں یا کنشک' ان کی انفرادی سیرت وکردار سے قطع نظر' ان کا نظام بہر حال ملوکیت اور شہنشاہیت پر مبنی تھا! لہٰذا انہیں آج کے دور میں قابل تقلید مثالوں کی حیثیت سے پیش نہیں کیا جا سکتا! —— تاہم اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ خلافتِ راشدہ کے خاتمے کے بعد عالم اسلام میں تو رفتہ رفتہ ملوکیت نے جڑیں پکڑ لیں۔ چنانچہ ہمارے یہاں تو بقول جناب نعیم صدیقی ـ ''پھر تخت بچھے' ایوان سجے'' والا معاملہ شدید سے شدید تر ہوتا چلا گیا' البتہ غرناطہ اور قرطبہ کی یونیورسٹیوں سے حریت فکر اور علم وحکمت کے جو سوتے وسطی یورپ کے ممالک تک پہنچے' جن کے زیر اثر وہاں ایک جانب احیاء العلوم اور دوسری جانب اصلاح مذہب کی تحریکیں برپا ہوئیں' ان ہی کے ایک منطقی نتیجے کے طور پر بالآخر انقلابِ فرانس کا ظہور ہوا اور دنیا میں دوبارہ ری پبلکن طرزِ حکومت کا آغاز ہوا۔ بہرحال جدید تصورِ ریاست کا یہ عنصر ہم مسلمانوں کے لئے اپنی ''گمشدہ متاع'' کی حیثیت رکھتا ہے' لہٰذا حدیث نبویؐ کے الفاظ کے مطابق اس پر تو ہمارا ''حق'' دوسروں سے فائق ہے۔

البتہ آخری چیز جو کُل کی کُل مغرب کی ''یافت'' کی حیثیت رکھتی ہے اور جس پر ہمیں انگریزی زبان کی ضرب المثل ''شیطان کو بھی اس کا جائز حق ضرور دیا جانا چاہئے!'' کے مطابق مغرب کا ممنون ہونا چاہئے' اور جسے ان کے شکریئے کے ساتھ قبول کر لینا ہمارے اپنے حق میں مفید اور خواہ مخواہ رد کر دینا ہمارے اپنے لئے ہی مضر ہے' وہ ہے ایک جمہوری ریاست اور ری پبلکن طرزِ حکومت کے تین اعضائے رئیسہ یعنی مقننہ' انتظامیہ اور عدلیہ کی تعیین' پھر ان کے جداگانہ وظائف وفرائض کا تعین' اور سب سے بڑھ کر ان کے مابین اختیارات کے ضمن میں تحدیدات اور توازن کا نظام۔ اور ''آخری لیکن کمترین نہیں'' کے مصداق اس مخصوص نظامِ ریاست وحکومت کے لئے اساسی اداروں کی تشکیل' جیسے سیاسی جماعتوں اور انتخابات کا نظام' اور پریس اور اس کا مناسب اخلاقی حدود کے اندر تنقید کا حق وغیرہ!...... یہ تمام چیزیں' جیسے کہ پہلے عرض کیا

جا چکا ہے' درحقیقت ایک نوع کی ''ٹیکنالوجی'' ہی ہے۔ اسی لئے انہیں مجموعی طور پر ''سٹیٹ کرافٹ'' سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور اس کے ضمن میں وہی اصول درست ہے جو پہلے بیان ہو چکا ہے' یعنی یہ کہ جو چیز کتاب وسنت کے بالکل منافی ہو رد کر دی جائے' باقی کو اسلام کے اصولوں کے ساتھ شامل کر کے ''جدید اسلامی ریاست'' کا ڈھانچہ تیار کیا جائے۔

اس سلسلے میں جو کچھ اب تک بیان ہو چکا اس کا خلاصہ اور لب لباب یہ ہے کہ —

چونکہ:

۱) اسلام نے ریاست کے ضمن میں صرف اصول دیئے ہیں' تفصیلی خاکہ یا ڈھانچہ کوئی نہیں دیا۔

۲) ری پبلکن طرزِ حکومت نہ صرف اسلام کی روح کے عین مطابق ہے' بلکہ اصلاً اسی کا عطا کردہ ہے۔

۳) جدید ریاست کے اعضاءِ رئیسہ (مقننہ' انتظامیہ اور عدلیہ) کے وظائف و فرائض' ان کے مابین حقوق و اختیارات کی تقسیم اور توازن کا نظام اور مختلف جمہوری اداروں کی تشکیل' یعنی فی الجملہ ''سٹیٹ کرافٹ'' ایک نوع کی ٹیکنالوجی ہے جو اکثر و بیشتر ''مباح کے درجہ میں ہے —

لہٰذا اگر عہد حاضر کی جمہوری ریاست کے تصورات میں صرف دو تبدیلیاں کر دی جائیں تو وہ ''جدید اسلامی ریاست'' کی صورت اختیار کر لے گی۔ پہلی تبدیلی یہ کہ سیکولرزم کے تصور کو نکال دیا جائے اور اسلام کو صرف ''سرکاری مذہب'' کے طور پر نہیں بلکہ دین اور دنیا اور مذہب و ریاست کی جامع حقیقت کی حیثیت سے پورے نظامِ زندگی پر غالب و نافذ قرار دیا جائے اور دوسری تبدیلی یہ کہ ''وطنی قومیت'' کی بجائے ''مسلم قومیت'' کو بطورِ اساس قبول کیا جائے۔

اس کے عملی نتیجے کو سادہ ترین الفاظ میں یوں بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ — عہد حاضر کے کسی بھی جمہوری نظامِ حکومت میں' خواہ وہ پارلیمانی ہو' خواہ صدارتی' اور خواہ

وحدانی ہو خواہ وفاقی' اگر تین چیزیں شامل کر لی جائیں' جو باہم لازم و ملزوم اور ایک دوسرے کے منطقی نتیجے کی حیثیت رکھتی ہیں تو وہ اسلامی ریاست بن جائے گی۔ یعنی:

۱) اولاً یہ تسلیم کیا جائے کہ یہاں حاکمیت اصلاً اللہ کی ہے اور انسان کے پاس صرف ''خلافت'' ہے۔

۲) دوسرے یہ کہ یہاں کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ کو ہر چیز پر بالاتری اور بالادستی حاصل ہوگی اور کوئی قانون کتاب و سنت کے منافی نہیں بنایا جا سکے گا ـــــ اور

۳) تیسرے یہ کہ اگرچہ جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت اور عقیدے' عبادات اور پرسنل لاء کی آزادی کی ضمانت کے حق میں بلالحاظِ رنگ و نسل اور بلاامتیاز عقیدہ و مسلک تمام شہری برابر کے شریک ہوں گے' لیکن قانون سازی کے عمل اور ریاست کی بلند ترین پالیسی کی تعیین و تشکیل میں صرف وہی لوگ شریک ہو سکیں گے جو اللہ اور محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان رکھتے ہیں۔

اب اگر ان تینوں اعتبارات سے وطنِ عزیز پاکستان کے معروضی حالات کا جائزہ لیا جائے تو حسب ذیل صورت سامنے آتی ہے:

۱) چونکہ پاکستان ایک ایسی زبردست عوامی تحریک کے نتیجے میں قائم ہوا تھا جس کی بنیاد ''مسلم قومیت'' کے اصول اور نظریئے پر تھی' لہٰذا جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے وہ تو یہاں بہت جلد اور بہت آسانی سے طے ہوگئی تھی۔ چنانچہ ''قراردادِ مقاصد'' کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی حاکمیتِ مطلقہ کے اقرار کے ساتھ ساتھ وضاحت کر دی گئی تھی کہ اہالیانِ پاکستان کے پاس جو بھی اختیار و اقتدار ہے وہ حاکمِ حقیقی یعنی اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ''مقدس امانت'' کی حیثیت رکھتا ہے اور صرف ان حدود کے اندر اندر استعمال ہو گا جو اس اصل حاکم نے معین کر دی ہیں۔ مزید برآں یہاں جمہوریت' حریت' مساوات' رواداری اور سماجی عدل کے وہ تصورات اور معیارات نافذ کئے جائیں گے جو اسلام نے معین کئے ہیں۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ اس اعتراف اور اعلان نے ریاستِ پاکستان کی اساسی نوعیت اور آئندہ بننے والے مفصل دستور کے خدوخال کو واضح طور پر

متعین کر دیا تھا۔ اور بیسویں صدی عیسوی کے وسط میں جبکہ پورے عالمِ انسانی پر مادیت' الحاد اور سیکولرزم کا فیصلہ کن غلبہ تھا دس کروڑ سے زائد انسانوں کی نمائندہ دستور ساز اسمبلی کی جانب سے یہ اعلان اور اظہار ــــــ ع ''کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اِس زمانے میں!'' کے مصداق ہرگز کسی ''معجزے'' سے کم نہیں تھا۔

لیکن چونکہ اس قرارداد کی حیثیت صرف ''مقدمۂ دستور'' کی رہی' جس کی بنیاد پر کسی عدالت میں کوئی مرافعہ دائر نہیں کیا جا سکتا تھا' لہٰذا یہ عملی طور پر بالکل غیر مؤثر رہی اور مرحوم صدر ضیاء الحق نے ۱۹۸۵ء میں اسے دفعہ ۲۔الف کے طور پر ''جزوِ دستور'' بنایا بھی تو ایسے نیم دلانہ اور سطحی انداز میں کہ دستور کی دیگر مختلف دفعات میں جو چیزیں کسی اعتبار سے اس سے مختلف یا متصادم موجود تھیں انہیں بھی برقرار رکھا اور خارج یا ساقط نہیں کیا۔ لہٰذا اس سے اعلیٰ عدالتوں کے فیصلوں میں شدید ابہام بلکہ تصادم پیدا ہوا کہ کسی صوبائی عدالتِ عالیہ نے اس دفعہ ۲۔الف کو دوسری دفعات کی ''ناسخ'' مان کر اس کے مطابق کوئی فیصلہ صادر کر دیا تو سپریم کورٹ نے دستور پاکستان ہی کی کسی دوسری دفعہ کے حوالے سے اسے کالعدم قرار دے دیا۔

بہر حال اب اگر ہمیں فی الواقع خلوصِ قلب اور عزمِ مصمم کے ساتھ پاکستان کو حقیقی اسلامی ریاست بنانا ہے تو لازم ہے کہ اس قرارداد کو دستور کی دفعہ ۲۔الف نہیں بلکہ اصل دفعہ ۲ قرار دیا جائے' اور اصل دفعہ کے موجود الفاظ یعنی ''پاکستان کا سرکاری مذہب اسلام ہوگا'' کو یا تو سرے سے حذف کر دیا جائے۔ اس لئے کہ یہ سیکولرزم کے نظریۂ ریاست کے تحت مذہب کے محدود تصور کی غمازی کرتے ہیں یا انہیں قراردادِ مقاصد کی توضیحِ مزید کے طور پر مزید ذیلی دفعہ ۲۔الف کی حیثیت دی جائے۔

۲) بالکل یہی معاملہ قرآن وسنت کی کامل بالادستی کے ضمن میں ہوا۔ یعنی یہ کہ اگرچہ یہ دفعہ پاکستان کے ہر دستوری مسودے میں شامل رہی کہ: ''یہاں کوئی قانون سازی کتاب وسنت کے منافی نہیں کی جا سکتی'' لیکن یہ بھی ایک طویل عرصے تک تو صرف ''رہنما اصولوں'' کے زمرے میں شامل اور اس لئے عملاً غیر مؤثر رہی۔ اور

جنرل ضیاء الحق صاحب کے دور میں اس پر کسی قدر عملی پیش رفت کا آغاز ہوا بھی تو ایسے نیم دلانہ سے بھی کم تر انداز میں اور اتنی اگر مگر کے ساتھ کہ پورا معاملہ ایک لاحاصل مشق (Exercise in futility) ہی نہیں باقاعدہ کھیل تماشے کی صورت اختیار کر گیا۔ تاہم چونکہ یہ معاملہ ''اللہ کی تشریعی حاکمیت'' کے بالفعل نفاذ کی واحد عملی صورت کی حیثیت رکھتا ہے لہٰذا اس کے گہرے تجزیئے اور اس کے صحیح اور غلط اجزاء کی واضح نشان دہی کی شدید ضرورت ہے۔

اس سلسلے کی پہلی اور اہم ترین بات یہ ہے کہ اس کا جو عملی راستہ اختیار کیا گیا وہ اصولی طور پر بالکل درست تھا۔ یعنی یہ کہ اس امر کا فیصلہ کہ آیا کوئی رائج الوقت قاعدہ اور قانون یا زیرِ تجویز مسودۂ قانون' کلی یا جزوی طور پر کتاب وسنت سے متصادم یا ان کی حدود سے متجاوز ہے یا نہیں اعلیٰ عدالتوں ہی کو کرنا چاہئے۔ اس لئے کہ جدید تصورِ ریاست کے مطابق دستورِ مملکت کی پاسداری اور اس کے مطابق انتظامیہ اور مقننہ کی نگرانی اعلیٰ عدالتوں ہی کا فریضہ اور وظیفہ ہے۔ یعنی جس طرح دستور میں طے شدہ بنیادی حقوقِ شہریت پر انتظامیہ یا مقننہ کی دست درازی پر ہر شہری کو حق حاصل ہوتا ہے کہ ملک کی اعلیٰ عدالتوں کے دروازے پر دستک دے' اسی طرح اگر کسی ریاست کے دستور میں یہ طے کر دیا گیا ہو کہ یہاں قرآن اور سنتِ رسول ﷺ کو مطلق بالادستی حاصل رہے گی اور کوئی قاعدہ یا قانون کتاب وسنت کے منافی نہیں بنایا جا سکے گا تو اگر کسی شہری کا یہ خیال ہو کہ کسی معاملے میں اس اصول کی خلاف ورزی ہو رہی ہے تو اسے حق حاصل ہونا چاہئے کہ وہ اعلیٰ عدالتوں سے چارہ جوئی کر سکے۔ اور ملک کی اعلیٰ ترین عدالت کو یہ اختیار حاصل ہونا چاہئے کہ وہ اس کے ضمن میں نفیاً یا اثباتاً فیصلہ صادر کر سکے' اور اگر اس کی رائے میں کوئی قانون جزوی یا کلی طور پر اس دفعہ کی زد میں آتا ہو تو اسے کالعدم قرار دے سکے۔ اگرچہ اس طرح جو خلا پیدا ہوگا اسے پُر کرنے اور کالعدم قرار پانے والے قانون کی جگہ متبادل قانون سازی کا اختیار بہرصورت مقننہ ہی کو حاصل رہے گا جس کے لئے اسے معین مہلت دی جا سکتی ہے' بلکہ دی جانی چاہئے۔

اس مشکل مرحلے کے اس واحد ممکن العمل حل کے علاوہ جتنی دوسری صورتیں آج تک تجویز کی گئی ہیں وہ یا روحِ دین سے متصادم ہیں' یا روحِ عصر کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتیں۔ مثلاً سب سے پہلی تجویز جو خود بخود ذہن میں آتی ہے مقننہ کے ساتھ ایک ''علماء بورڈ'' کی ہے۔ چنانچہ پاکستان کی دستور سازی کی تاریخ کے دوران بھی سب سے پہلے اسی تجویز کو اختیار کیا گیا تھا' جس نے بعد میں ذرا سے فرق کے ساتھ ''اسلامی نظریاتی کونسل'' کی صورت اختیار کی۔ لیکن اس کے ضمن میں فوری طور پر جو سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ آیا اس بورڈ یا کونسل کا فیصلہ آخری اور حتمی ہوگا یا اس کی حیثیت محض ''سفارش'' کی ہوگی۔ پہلی صورت اختیار کی جائے تو یہ ''تھیا کریسی'' بن جاتی ہے' جو روحِ عصر سے بھی براہِ راست متصادم ہے' اور واقعہ یہ ہے کہ اسلام میں بھی اُس کی کوئی گنجائش نہیں ہے' اور دوسری صورت میں اگر آخری فیصلہ کا دار و مدار منتخب نمائندوں کی عددی اکثریت ہی پر رہتا ہے تو یہ نہ صرف یہ کہ ''حاکمیتِ عوام'' کا وہ سیکولر تصور ہے جو اللہ کی حاکمیت سے متصادم ہے بلکہ اس صورت میں بورڈ یا کونسل کی حیثیت عضوِ معطل کی سی ہو جاتی ہے۔ (جیسا کہ فی الواقع ہوا بھی۔ چنانچہ اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کے انبار وزارتِ قانون کی الماریوں میں دفن ہوتے چلے گئے اور قوم کا وہ پیسہ جو اس پر خرچ ہوا مسلسل ضائع ہوتا رہا)۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال مرحوم نے اپنے خطبۂ ششم میں اگرچہ علماء بورڈ کی تجویز کو عارضی طور پر اختیار کرنے کی اجازت دی تھی' تاہم اسے ''خطرناک'' بھی قرار دیا تھا اور مستقل نظام کے اعتبار سے اسے بالکل مسترد کر دیا تھا۔

اس کے برعکس اگر کتاب و سنت کی بالادستی کو اصولاً تسلیم کر کے اس کے عملی نفاذ کے معاملے کو کلیتاً پارلیمنٹ یا مقننہ ہی کی صوابدید پر چھوڑ دیا جائے تو منطقی طور پر لازم ہوگا کہ پارلیمنٹ کے لئے انتخابات میں حصہ لینے کی اہلیت کے ضمن میں سیرت و کردار کی درستی اور اس معاملے میں کم از کم معیار کے لزوم کے ساتھ ساتھ دین و شریعت کے بنیادی علم و فہم کو بھی لازمی شرط قرار دیا جائے' اور ایک طویل المیعاد منصوبے کے اعتبار

سے یہ نا قابلِ عمل بھی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت علامہ نے بھی اپنے مذکورہ بالا خطبے میں علماء بورڈ کے متبادل کے طور پر یہی تجویز فرمایا ہے کہ ایک جانب علماءِ دین اور ماہرینِ شریعت خود مقننہ میں مؤثر حیثیت سے شریک ہوں اور دوسری جانب ملک کے نظامِ تعلیم میں دین و شریعت کے علم وفہم کو جزو لاینفک کی حیثیت سے شامل کیا جائے۔ تاہم ایک تو فی الوقت کم از کم قابلِ دید مستقبل کی حد تک یہ دونوں باتیں حاصل اور دستیاب نہیں ہیں۔ دوسرے ہر معاملے میں آخری فیصلہ کا دار و مدار بالعموم نہایت باریک اور پیچیدہ قانونی اور علمی نکات پر ہوتا ہے جن پر بحث وتمحیص کی مناسب جگہ جس طرح ''جلسۂ عام'' اور ''ہجومِ مؤمناں'' نہیں ہوتا اسی طرح پارلیمنٹ کا فلور بھی نہیں ہوتا جہاں ساری بحث اور کُل جنگ حزبِ اقتدار اور حزبِ اختلاف کے مابین سیاسی مصلحتوں کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ بلکہ اس کے لئے مناسب جگہ عدالت ہی ہوتی ہے جہاں ماہرینِ قانون و دستور کو بھی بحث و تمحیص کا پورا حق اور موقع حاصل ہوتا ہے اور علماءِ دین اور ماہرینِ شریعت کو بھی اپنے دلائل پیش کرنے کی پوری آزادی حاصل ہوسکتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جانبین کی طرف سے مسئلے کی پوری چھان پھٹک' اور جملہ مخالف و موافق دلائل کے سامنے آنے کے بعد عدالت کے لئے صحیح فیصلے تک پہنچنا قطعاً مشکل نہیں رہتا۔

الغرض' ضیاء الحق مرحوم کے زمانے میں قرآن وسنت کی بالادستی کی عملی تنفیذ کے ضمن میں پیش رفت کے لئے جو راستہ اختیار کیا گیا وہ اصولاً تو درست تھا لیکن ع ''دیوانہ بناتا ہے تو دیوانہ بنا دے۔ ورنہ کہیں تقدیر تماشا نہ بنا دے!'' کے مصداق چونکہ وہ اس معاملے میں بالفعل ''دیوانگی'' کی بجائے زمانہ سازی والی ''فرزانگی'' پر عمل پیرا تھے' لہٰذا انہوں نے درست سمت میں اقدام کے ساتھ تین کام ایسے بھی کئے جنھوں نے اس پورے معاملے کو فی الواقع ''تماشا'' بنا کر رکھ دیا۔ یعنی:

۱) اولاً شرعی عدالتوں یا عدالت کا جداگانہ نظام' جس سے دین و دنیا اور مذہب و ریاست کی ''دوئی'' اور علیحدگی کے سیکولر تصور کو تقویت حاصل ہوئی۔

۲) شرائطِ ملازمت اور حقوق و مراعات کے باب میں شرعی عدالت کے جج صاحبان کا معیار موجودہ دنیا کے مروّجہ اور مسلّمہ معیارات (جو خود ہمارے ملک میں بھی دوسری عدالتوں کے ضمن میں رائج ہیں) سے کم تر رکھا' جس سے ان شبہات کو تقویت حاصل ہوئی کہ درحقیقت یہ سارا کھیل اپنی سیاسی مصلحتوں اور مقاصد کے تحت کھیلا جا رہا ہے۔ اور

۳) سب سے بڑھ کر یہ کہ ''وفاقی شرعی عدالت'' کے دونوں ہاتھوں میں دو ہتھکڑیاں بھی پہنا دیں' اور دونوں ٹانگوں میں دو بیڑیاں بھی ڈال دیں —— یعنی ایک جانب دستورِ پاکستان اور عدالتی قوانین کو اس کے دائرہ کار سے باہر قرار دے دیا تو دوسری جانب مالی معاملات' اور حد یہ ہے کہ عائلی قوانین تک کو اس کی ''دستبرد'' سے محفوظ کر دیا اور اس طرح گویا پورے ملک اور پوری قوم کو اس پوزیشن میں کھڑا کر دیا جو سورۃ البقرۃ کی آیت ۸۵ میں ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے کہ:

﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ۚ﴾

''تو کیا تم (ہماری) کتاب کے کچھ حصّے کو مانتے ہو اور کچھ حصے کو نہیں مانتے؟ تو جان لو جو لوگ یہ روش اختیار کریں گے ان کی سزا اس کے سوا کچھ نہیں کہ دنیا کی زندگی میں ذلت اور رسوائی میں مبتلا کئے جائیں' اور قیامت کے دن شدید ترین عذاب میں جھونک دیئے جائیں!'' (اعاذنا اللہ من ذلک)

قصہ مختصر' اگر ہماری نیت اور ارادہ پاکستان میں فی الواقع ایک حقیقی اسلامی ریاست قائم کرنے کا ہے تو اس کے لئے لازم ہے کہ ملک کے دستورِ اساسی کی نافذ العمل اور واجب العمل دفعات میں قراردادِ مقاصد کو دفعہ ۲ کی حیثیت دینے کے فوراً بعد اس دفعہ کو شامل کیا جائے کہ ''یہاں اللہ کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کی سنت کو ہر معاملے میں مطلق بالادستی حاصل ہوگی اور کسی بھی سطح پر کوئی قاعدہ یا قانون ایسا نہیں بنایا جا سکے گا جو کتاب و سنت کے منافی ہو!'' اور اس کی عملی تنفیذ کا یہی راستہ اختیار کیا

جائے کہ ہر شہری کو حق حاصل ہو کہ اس پہلو سے کسی بھی معاملے میں اعلیٰ عدالتوں کے در پر دستک دے سکے اور ملک کی اعلیٰ ترین عدالت کو یہ اختیار حاصل ہو کہ اس اصول کی بنیاد پر کسی بھی قانون یا قاعدے کو جزوی یا کلی طور پر کالعدم قرار دے سکے!

البتہ یہ ظاہر ہے کہ بحالاتِ موجودہ اس ''کڑوی گولی'' کا نگلنا کوئی آسان کام نہیں ہے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ ملک و قوم کے خواص و عوام کی معتدبہ اور مؤثر تعداد اسلام پر بالفعل عمل پیرا ہونے اور مسلمان جینے اور مسلمان مرنے کا عزمِ مصمم کر لے اور بحیثیت مجموعی قوم میں اسلام کے حق میں ایک ''مجموعی ارادہ'' (Collective Will) نہ صرف پیدا ہو جائے بلکہ بالفعل ظہور کر کے جانی و مالی قربانیوں کے ذریعے اپنا لوہا منوا لے۔ اور چونکہ تا حال ملک کی بیشتر مذہبی جماعتوں نے' بجائے اس کے کہ اپنی جملہ مساعی کو اسی ایک نکتے پر مرکوز کرتیں' انہیں کشاکشِ اقتدار کے میدان میں ضائع کیا ہے' لہٰذا نفاذِ شریعت کے ساتھ جو مذاق ضیاء الحق مرحوم نے متذکرہ بالا صورت میں کیا تھا اس سے بھی کہیں آگے بڑھ کر نام نہاد شریعت بل کے ذریعے شریعت کی جو مٹی آئی جے آئی کی حکومت کے ہاتھوں پلید ہوئی وہ توع ''جو میں بت کدے میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی ہری ہری!'' کے مصداق اس داستان کا تاریک ترین باب ہے۔

جدید اسلامی ریاست میں قومیت کا مسئلہ

عہد حاضر میں ''قومیت'' کا ایک تصور تو وہ ہے جسے انگریزی میں نیشنلٹی (Nationality) سے تعبیر کیا جاتا ہے اور عربی میں ''جنسیت'' سے۔ یہ ایک خالص انتظامی معاملہ ہے جو صرف ملک سے باہر جانے کے لئے ''جوازِ سفر'' یعنی پاسپورٹ میں اندراج کے کام آتا ہے۔ (واضح رہے کہ عربی زبان میں پاسپورٹ کو واقعتاً ''جوازِ سفر'' ہی کہا جاتا ہے اور اس لفظ کے حوالے سے جو شعر مجھے ہمیشہ یاد آ جایا کرتا ہے' اور جو عہد حاضر کے بہت سے رہنماؤں پر نہایت خوبصورتی کے ساتھ چسپاں ہوتا ہے' قارئین کی تفننِ طبع کے لئے پیش خدمت ہے۔ ''تری رہبری کا یہ فیض ہے' قدم اہل شوق کے رک گئے۔ نہ کوئی جوازِ سفر ملا نہ کوئی دلیل قیام ہے!'') اس معنی میں

ہندوستان میں بسنے والا ہر انسان خواہ مسلمان ہو یا ہندو اور عیسائی ہو یا پارسی ''ہندی'' (انڈین) کہلاتا ہے اور اسی طرح پاکستان میں آباد ہر انسان خواہ کسی بھی صوبے میں رہائش پذیر ہو' پھر خواہ کسی بھی نسل سے تعلق رکھتا ہو اور کسی بھی مذہب یا مسلک سے منسلک ہو''پاکستانی'' قرار پاتا ہے۔ بہرحال قومیت کا یہ تصور ایک انتظامی ضرورت ہونے کے اعتبار سے ''مباح'' ہے اور اس میں دینی اعتبار سے کوئی حرج نہیں ہے۔

لیکن ''قومیت'' کے مسئلے کا دوسرا پہلو خالص نظریاتی اور فلسفیانہ ہے۔ چنانچہ عہد حاضر کا مشہور و معروف اور مقبول و محبوب نظریہ تو وہ ہے جسے ''وطنی قومیت'' سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جس کی رو سے کسی ملک میں رہنے والے تمام انسان خواہ وہ اس کے کسی بھی حصے یا علاقے میں آباد ہوں' پھر خواہ کسی بھی نسل سے متعلق ہوں' کوئی بھی زبان بولتے ہوں' حتیٰ کہ کسی بھی عقیدے یا مذہب کے پیروکار ہوں' کم از کم دستوری اور قانونی اعتبار سے ان کے جملہ ''حقوق'' بالکل ''مساوی'' ہوتے ہیں۔ اور چونکہ اس وقت پوری دنیا میں ''نیشن سٹیٹ'' کا یہ تصور پوری طرح چھایا ہوا ہے لہٰذا اس سے مختلف کسی بات کو نہ صرف یہ کہ ذہن آسانی کے ساتھ قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا بلکہ اس پر غور کرنے کے لئے بھی بہ مشکل ہی آمادہ ہوتا ہے۔ تاہم یہ حقیقت بادنیٰ تامل سمجھ میں آجاتی ہے کہ یہ تصور ''اسلامی ریاست'' ہی نہیں' کسی بھی نظریاتی ریاست کے ساتھ کوئی مطابقت نہیں رکھتا۔ اس لئے کہ کسی نظریاتی معاشرے میں اگرچہ نسل' رنگ اور زبان کی بنا پر تو انسانوں کے مابین کوئی تقسیم یا تفریق نہیں ہوتی' لیکن ظاہر ہے کہ خود نظریئے کی اساس پر تو ایک امتیاز قائم ہوتا ہے اور اس کی بنا پر ریاست کے نظام کو بالفعل چلانے کی اصل ذمہ داری اور اس کی اعلیٰ ترین سطح پر پالیسی کی ترجیحات طے کرنے کے معاملے میں ایک فرق اور تفاوت بہرحال وجود میں آتا ہے۔ چنانچہ ''اسلامی ریاست'' میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کا دستوری اور آئینی سطح پر' حقوق اور اختیارات کے اعتبار سے بالکل ''مساوی'' ہونے کا تصور نہ صرف یہ کہ قطعاً غیر منطقی اور غیر معقول ہے' بلکہ بجائے خود ''اسلامی ریاست'' کے بنیادی تصور کی کامل نفی کے مترادف ہے۔

اس مسئلے کے خالص علمی اور نظری پہلو سے قطع نظر' خاص طور پر پاکستان کا معاملہ تو یہ ہے کہ یہ قائم ہی وطنی قومیت کے متذکرہ بالا معروف تصور کی نفی پر ہوا ہے۔ اس لئے کہ انڈین نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ کے مابین اصل نزاع ہی یہ تھا کہ کانگریس وطنی قومیت کے نظریئے کی علمبردار تھی جبکہ مسلم لیگ مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کی دعوے دار تھی۔ اور مسلمانوں کی قومیت کی اساس ان کے جداگانہ نظریات وعقائد' زندگی کے ہر شعبے سے متعلق ان کے علیحدہ قوانین وضوابط اور فی الجملہ ان کی جداگانہ تہذیب و ثقافت کو قرار دیتی تھی۔ چنانچہ ''مسلم قومیت'' کی اسی اساس پر حصولِ پاکستان کی تحریک چلائی گئی' جو کامیاب بھی اسی لئے ہوئی کہ مسلم لیگ نے مسلمانانِ ہند کی عظیم اکثریت کے احساسات وجذبات کی صحیح ترجمانی کی تھی۔ گویا علامہ اقبال کا یہ شعر کہ ۔

''اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ!''

اگرچہ نظری اور اصولی طور پر تو پوری امت مسلمہ اور جملہ مسلمانانِ عالم پر منطبق ہوتا ہے' تاہم واقعاتی اور تاریخی اعتبار سے بھی کم از کم پاکستان پر تو صد فی صد صادق آتا ہے' اس لئے کہ اس نے تو گویا جنم ہی اس نظریئے کے بطن سے لیا ہے کہ ۔

''ان کی جمعیت کا ہے ملک ونسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری!''

لہٰذا اس ملک میں وطنی قومیت کے نظریئے کا عملی نفاذ منطقی اعتبار سے خود اس کے وجود ہی کی نفی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور یہ واضح رہنا چاہئے کہ منطق کی تلوار بڑی بے رحم ہوتی ہے اور اس عالمِ اسباب میں جو شے اپنا منطقی جواز کھو بیٹھے وہ جلد یا بدیر اپنا وجود بھی کھو بیٹھتی ہے اور بالآخر معدوم ہو کر رہتی ہے!

اس جملہ معترضہ سے قطع نظر' اسلامی ریاست میں اگرچہ بعض بنیادی حقوقِ شہریت میں تو مسلم اور غیر مسلم سب برابر کے شریک ہوں گے' لیکن دو سطحوں پر غیر مسلموں کی شرکت وشمولیت عقلی اعتبار سے غیر منطقی اور اخلاقی اعتبار سے محض دھوکا اور

فریب کے مترادف ہے۔ یعنی:

۱) ''قانون سازی'' کو اگر حق قرار دیا جائے تب بھی' اور ذمہ داری سے تعبیر کیا جائے تب بھی' یہ اسلامی ریاست میں صرف مسلمانوں کے کرنے کا کام ہے۔ اس میں کسی غیر مسلم کی شرکت یا شمولیت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

چنانچہ قانون سازی کو اگر حق سمجھا جائے' جیسا کہ عہدِ حاضر میں عام طور پر سمجھا جاتا ہے' تب بھی چونکہ اسلامی ریاست میں قانون کا اصل منبع قرآن اور سنت رسول ﷺ ہیں لہٰذا جو لوگ نہ قرآن پر ایمان رکھتے ہوں نہ رسول اللہ ﷺ پر' انہیں یہ حق کسی بھی دلیل کے تحت نہیں دیا جا سکتا۔ سوائے اس کے کہ صرف اس حقیقتِ واقعی کے پیش نظر کہ چونکہ ایک ایسے ملک میں جس کے باشندوں کی عظیم اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہو' اسمبلی یا پارلیمنٹ میں غیر مسلموں کی تعداد بہرصورت آٹے میں نمک کے برابر ہوگی لہٰذا وہ کسی طرح مؤثر نہیں ہو سکتے' یہ خیال کیا جائے کہ محض دنیا کو دھوکہ دینے کی خاطر انہیں بھی نیشنل اسمبلی یا پارلیمنٹ میں شرکت کا موقع دینے میں کوئی حرج نہیں ہے! تاہم یہ معاملہ ''گندم نمائی اور جو فروشی'' کے مترادف ہے جو اسلامی ریاست کے اعلیٰ اور ارفع اخلاقی تصورات کے ساتھ کوئی میل نہیں کھاتا۔

مزید برآں' حقیقت کے اعتبار سے اسلامی ریاست میں قانون سازی کا معاملہ ''حق'' نہیں' ایک نازک ''ذمہ داری'' کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی اصل نوعیت ''اجتہاد'' کی ہے جس کے تقاضوں کو صحیح طور پر پورا کرنے کے لئے ایمان کے بھی صرف زبانی اقرار کی نہیں توحید' معاد اور رسالت پر گہرے ''یقین'' کی ضرورت ہے' تو جو لوگ زبانی اقرار تک سے محروم ہوں اُن پر اِس عظیم ذمہ داری کا بوجھ کس طرح ڈالا جا سکتا ہے؟ اور ان سے یہ توقع منطق کے کس اصول یا قاعدے کے تحت رکھی جا سکتی ہے کہ وہ کسی زیرِ غور مسئلے میں کتاب و سنت کے اصل منشأ اور حقیقی مقصد کو معین کرنے میں مقدور بھر سعی و جہد کا حق ادا کر سکیں گے؟

۲) ثانیاً کسی نظریاتی ریاست کی اعلیٰ ترین پالیسی کی سطح پر اوّلین ترجیح اس

نظریئے کے فروغ اور عالمی سطح پر اس کی نشر و اشاعت کو حاصل ہوتی ہے جس پر اس کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سوویت یونین کی حکومت اور قیادت پر چینی کمیونسٹوں کا اوّلین الزام ہی یہ تھا کہ اس نے مارکسی نظریئے کی علمبرداری اور اس کے عالمی سطح پر فروغ کو پسِ پشت ڈال کر ''روسی نیشنلزم'' کی راہ اختیار کر لی ہے۔ تاہم یہ صرف ایک ''تشبیہہ'' ہے' دلیل نہیں۔ اس لئے بھی کہ اب خود چین بھی ''زوالِ علم و عرفاں'' کی اسی کیفیت سے دوچار ہو چکا ہے' اور اس لئے بھی کہ ہمارے لئے اصل دلیل قرآن اور حدیث ہیں' جنہیں کبھی کوئی زوال نہیں آ سکتا۔ بہرحال قرآن و حدیث دونوں کی رُو سے کسی بھی اسلامی ریاست کی پالیسی کی ترجیح اوّل ہی نہیں' اس کا عین مقصدِ وجود ہی یہ ہوتا ہے کہ عالمی سطح پر اللہ کے دینِ حق کا بول بالا کرنے کے اس مشن کی تکمیل کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا جائے جس کے لئے محمد رسول اللہ ﷺ مبعوث فرمائے گئے تھے۔ اور ظاہر ہے کہ جو شخص نہ اللہ پر ایمان رکھتا ہو' نہ اس کے دین کی حقانیت پر اور نہ رسول اللہ ﷺ پر یقین رکھتا ہو' نہ ان کے مشن اور مقصدِ بعثت پر' اس سے کیسے توقع رکھی جا سکتی ہے کہ وہ اپنی ذہنی اور فکری صلاحیتوں کو اسلامی ریاست کے اس مقصدِ وجود کی تکمیل تو کجا اس کی اس ترجیحِ اوّل کی تقویت تک کے لئے صَرف کرے گا' اِلّا یہ کہ خود اپنے عقیدے اور نظریئے کے ساتھ اس کا تعلق ''منافقانہ'' ہو اور وہ حقیقی اور باطنی طور پر مومن و مسلم ہو۔ بصورتِ دیگر اگر وہ واقعی اور حقیقی اعتبار سے کسی اور عقیدے اور نظریئے کا قائل ہو تو اس کا لازمی اور منطقی تقاضا یہ ہے کہ وہ شعوری یا غیر شعوری اور ارادی یا غیر ارادی طور پر اسلامی ریاست کے اس مقصدِ اعلیٰ کے خلاف کام کرے! اور واقعہ یہ ہے کہ کسی انسان کو اس پوزیشن میں لا کھڑا کرنا خود اس پر ''ظلم'' ہے۔ (چنانچہ فی الوقت پاکستان کے دستور میں یہ تضاد موجود ہے کہ قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے غیر مسلم ارکان سے بھی حلف لیا جاتا ہے کہ ''میں ہر ممکن کوشش کروں گا کہ اسلامی آئیڈیالوجی کو برقرار رکھوں جو پاکستان کے قیام کی بنیاد ہے!'')

۳) اسی اصول کے ''عکس'' (Converse) یا منطقی فرع (Corollary) کی

حیثیت سے' ایک نظریاتی ریاست ہونے کے ناطے اسلامی ریاست میں کسی کو اس کے اساسی نظریئے پر حملہ کرنے اور اس کے برعکس عقائد و نظریات کے پرچار کی اجازت بھی نہیں دی جاسکتی۔ اس لئے کہ اس کی تو اساس اور بنیاد ہی اس نظریئے پر قائم ہوتی ہے' اور اس نظریئے کے ضعف کا منطقی نتیجہ خود ریاست کا ضعف واضمحلال ہے۔ بنابریں اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کو خود اپنے لوگوں میں اپنے عقائد و خیالات کی تبلیغ و تلقین اور اپنی آئندہ نسلوں کی اپنے نظریات کے مطابق تعلیم و تربیت کا حق تو حاصل ہوتا ہے' مسلمانوں کو تبلیغ کی اجازت نہیں ہوتی۔

ان تین معاملات کے سوا' باقی جملہ بنیادی حقوقِ شہریت کے اعتبار سے اسلامی ریاست میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے مابین کوئی فرق و امتیاز نہیں ہوتا۔ یعنی:

۱) اسلامی ریاست بلالحاظ رنگ و نسل اور بلا امتیاز مذہب و مسلک اپنے ہر شہری کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کا ''ذِمہ'' لیتی ہے۔

۲) اسی طرح ہر شہری کو عقیدے' مذہبی عبادات اور معاشرتی رسومات کی کامل آزادی کی ضمانت دیتی ہے اور جملہ عبادت گاہوں کی حفاظت کا ذمہ لیتی ہے۔

۳) شادی بیاہ اور طلاق وغیرہ کے علاوہ قانونِ وراثت سمیت ''شخصی قوانین'' کے ضمن میں بھی کامل آزادی کی ضمانت دیتی ہے۔

۴) اور ان سے بھی بڑھ کر یہ کہ اسلامی ریاست اپنے ہر شہری کی بنیادی معاشی ضروریات کی کفالت کا بھی ''ذمہ'' لیتی ہے' خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم۔ (خاص اس موضوع پر مفصّل گفتگو' اِن شاء اللہ نظام اسلامی کی معاشی اور اقتصادی ترجیحات کے ضمن میں ہوگی۔)

واضح رہے کہ یہاں ''ذمہ'' کا لفظ بار بار اس لئے استعمال کیا گیا ہے کہ ''ذمی'' کی اسلامی اصطلاح کی اصل حقیقت واضح ہو جائے کہ یہ ہرگز نہ کوئی گالی ہے' نہ کسی بھی درجہ میں تحقیر آمیز لفظ' جیسا کہ اسلام کے دشمنوں نے اسے بنا دیا ہے تاکہ مسلمانوں کی نوجوان نسل کو خود اپنے آپ' اپنے ماضی اور اپنی دینی اصطلاحات سے بیگانہ ہی نہیں'

متنفر بنا دیا جائے۔ اس لئے کہ شہریت کے ان چار بنیادی حقوق کے اعتبار سے جن کا تذکرہ اوپر ہوا ہے اسلامی ریاست کا ہر شہری' خواہ مسلم ہو خواہ غیر مسلم' ریاست کا ''ذمی'' ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری کی ایک روایت میں جو حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' نبی اکرم ﷺ نے کسی انسان کے مسلمان قرار دیئے جانے کی شرائط و صفات کے تذکرہ کے بعد فرمایا ہے کہ:

((فَذٰلِکَ الْمُسْلِمُ الَّذِیْ لَهٗ ذِمَّةُ اللّٰهِ وَذِمَّةُ رَسُوْلِهٖ فَلَا تُخْفِرُوا اللّٰهَ فِیْ ذِمَّتِهٖ))

''ایسا شخص وہ مسلم ہے جس کے لئے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا ذمہ ہے'
پس اللہ کے اس ذمہ کی خلاف ورزی کر کے اللہ کی تحقیر کے مرتکب نہ بنو!''

تاہم شریعت اسلامی میں ''ذمی'' کی اصطلاح اس کے غیر مسلم شہریوں کے لئے اس لئے مخصوص کر دی گئی ہے کہ اسلامی ریاست اپنی متذکرہ بالا چار بنیادی ذمہ داریوں میں تو ان کو مسلمانوں کے ساتھ برابر کا شریک کرتی ہے۔ مزید برآں' تجارت' صنعت و حرفت اور سرکاری محکموں میں ملازمت کے دروازے بھی ان کے لئے مساوی طور پر کھولتی ہے اور دنیاوی ترقی کے جملہ مواقع یکساں طور پر فراہم کرتی ہے' تاہم قانون سازی اور ریاست کے بلند ترین مقصد یعنی کل روئے ارضی پر اللہ کے دین کا بول بالا کرنے کے لئے تن من دھن لگا دینے کی ذمہ داری کا ''بوجھ'' ان پر نہیں ڈالتی۔

یہاں اس امر کی وضاحت بھی مناسب ہے کہ اسلامی ریاست کے ضمن میں ذمی ہی کی طرح ''جزیہ'' کی اصطلاح کو بھی گالی بنا دیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ بھی ''جزا'' سے ماخوذ ہے اور ''بدلِ اشتراک'' کی حیثیت سے بالکل ٹیکس کے ہم معنی ہے۔ اس لئے کہ ہر ریاست اپنے شہریوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت (اور ایک فلاحی ریاست میں اس سے بھی بڑھ کر بنیادی معاشی ضروریات کی کفالت) کا جو ذمہ لیتی ہے اس کے لئے وسائل کی فراہمی کے لئے شہریوں سے مختلف قسم کے ٹیکس وصول کرتی ہے' لیکن ایک اسلامی ریاست میں مسلمانوں سے وصول کیا جانے والا سب سے بڑا ''ٹیکس'' زکوٰۃ ہے' جو عبادات میں شامل ہے' لہٰذا ''جزیہ'' کی اصطلاح صرف غیر مسلم

شہریوں سے وصول کئے جانے والے ٹیکس کے لئے مخصوص کردی گئی۔ (اس اعتبار سے دیکھا جائے تو عہد حاضر میں جملہ مسلمان ممالک میں بھی جہاں زکوٰۃ کا نظام قائم نہیں بلکہ دنیا کے عام رواج کے مطابق مختلف قسم کے ٹیکسوں ہی کا نظام رائج ہے گویا مسلم اور غیر مسلم سب ''جزیہ'' ادا کر رہے ہیں!)

حاصلِ بحث یہ کہ عہدِ حاضر کی اسلامی ریاست میں وطنی قومیت کے نظریئے کو صرف انتظامی اور بالخصوص غیر ملکی سفر کے ضمن میں پاسپورٹ کے اجراء کی حد تک تو قبول کیا جا سکتا ہے' لیکن ریاست کی اصل اساس ''مسلم قومیت'' پر قائم ہوگی جس میں مقننہ اور عدلیہ کی بلند ترین سطح پر غیر مسلموں کی شرکت اور شمولیت خارج از بحث ہے۔

اس مرحلے پر مختصر گفتگو اس موضوع پر بھی ہو جائے تو مناسب ہے کہ اگرچہ خالص اصولی اعتبار سے تو جدید اسلامی ریاست کے لئے پارلیمانی اور صدارتی طرزِ حکومت کو بالکل یکساں طور پر مباح کی حیثیت سے اختیار کیا جا سکتا ہے' تاہم عملی اعتبار سے صدارتی نظام زیادہ مناسب ہے۔ اس لئے بھی کہ یہ خلافتِ راشدہ کے نظام کے قریب تر ہے' اور اس لئے بھی کہ اس میں سربراہِ ریاست اور سربراہِ حکومت کی ثنویت سے پیدا ہونے والی کوئی پیچیدگی موجود نہیں ہوتی۔ پھر اس لئے بھی کہ اس میں ریاست کے تین اعضائے رئیسہ ممکنہ حد تک علیحدہ علیحدہ مشخص اور معیّن ہوتے ہیں (جبکہ پارلیمانی نظام میں مقننہ اور انتظامیہ گڈمڈ ہو جاتی ہیں!) اور سب سے بڑھ کر اور آج کی بحث کے اعتبار سے اہم ترین' یہ کہ اس میں غیر مسلموں کی شرکت اور شمولیت کا معاملہ واضح طور پر معین ہو جاتا ہے۔ یعنی جہاں وہ مقننہ میں سرے سے شامل نہیں کئے جا سکتے' وہاں انتظامیہ اور عدلیہ کی صرف اعلیٰ ترین سطح کے سوا ان کی ہر سطح پر شمولیت ہو سکتی ہے۔ یعنی صدرِ مملکت یا ''خلیفۃ المسلمین'' کا عہدہ تو ظاہر ہے کہ صرف مسلمان کے لئے مختص ہوگا' اور صرف مسلمانوں ہی کے ووٹوں کی بنا پر وجود میں آئے گا' لیکن اس کے نیچے وزراء تک جو صدارتی نظام میں مقننہ کے منتخب ارکان میں سے نہیں بلکہ صرف ذاتی قابلیت اور فنی مہارت کی بنا پر مقرر کئے جا سکتے ہیں غیر مسلموں میں سے لئے جا سکتے

ہیں۔ اسی طرح صرف بلند ترین عدالت تو چونکہ مقننہ کے ''اجتہاد'' کے ضمن میں اس فیصلے کی مجاز ہوگی کہ یہ جزوی یا کلی طور پر قرآن وسنت کے حدود سے متجاوز ہے یا نہیں' لہٰذا اس کے جج تو لامحالہ صرف مسلمان ہی بن سکیں گے لیکن ماتحت عدالتیں چونکہ صرف مقننہ کے تدوین کردہ قوانین کے تحت فیصلے کرنے کی مجاز ہوں گی' لہٰذا ان میں غیر مسلموں کو بطور جج شریک کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

البتہ پاکستان کے معروضی حالات کے پیش نظر صدارتی نظام کے اختیار کرنے میں یہ قباحت واقعتاً موجود ہے کہ موجودہ وفاقی اکائیاں یعنی صوبے آبادی کے اعتبار سے بہت غیر متوازن ہیں اور اس کی بنا پر چھوٹے صوبوں کے لوگوں کو اندیشہ ہوسکتا ہے کہ صدارتی نظام میں صدر ہمیشہ کسی ایک ہی بڑے صوبے سے ہو اور اس طرح چھوٹے صوبے گویا مستقل طور پر ''غلام'' بن جائیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ ایک آزاد اور خودمختار ملک میں ان قسم کی رکاوٹوں کو دور کرنا ہرگز مشکل نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ پاکستان کے موجودہ صوبوں کا تعین اور ان کی حد بندی انگریزوں نے اپنی انتظامی سہولتوں اور مصلحتوں کے پیشِ نظر کی تھی۔ اور اب جبکہ پاکستان کے پورے دستوری اور سیاسی ڈھانچے کے ضمن میں ایک نئے ''سوشل کنٹریکٹ'' کی بات ہو رہی ہے ایسے نئے صوبوں کا قیام جن کی آبادی میں ایک حد تک برابری اور توازن پیدا ہو جائے نہایت آسان ہے۔ اور اگر کسی صوبے کے باشندوں کو تاریخی اور ثقافتی اسباب کی بنا پر اپنے صوبے کا نام اتنا محبوب ہو کہ وہ اسے کسی صورت میں تبدیل نہ کرنا چاہیں تب بھی ہمارے سامنے یہ مثال موجود ہے کہ امریکہ میں دو دو ریاستیں ایک ہی نام کی حامل موجود ہیں' جیسے نارتھ کیرولائنا اور ساؤتھ کیرولائنا اور نارتھ ڈکوٹا اور ساؤتھ ڈکوٹا وغیرہ۔ اور اس ضمن میں آخری بات یہ کہ جہاں انسان کے اب تک کے عمرانی ارتقاء کی بلند ترین صورت ایک جانب صدارتی جمہوری نظام ہے اور دوسری جانب وفاقی نظام حکومت' وہاں روحِ عصر کا تقاضا یہ بھی ہے کہ وفاقی اکائیاں حجم میں چھوٹی ہوں اور انہیں زیادہ سے زیادہ داخلی خودمختاری دی جائے۔

متذکرہ بالا تمدنی اور عمرانی ارتقاء کا ساتھ دینے کی بجائے ہم تاحال پارلیمانی نظامِ حکومت اور موجودہ صوبوں کو ان کے ناموں سمیت محض انگریز کی وراثت کے طور پر اپنائے ہوئے ہیں' ورنہ واقعہ یہ ہے کہ پارلیمانی نظام کے حق میں کوئی عقلی دلیل موجود نہیں ہے اور یہ صرف یا تو ان ممالک میں رائج ہے جہاں ماضی میں انگریزوں کی عملداری تھی یا پھر ان میں جو انگریزوں ہی کی طرح کی روایت پرستی کے تحت سابقہ نظامِ بادشاہت کی علامتوں اور یادگاروں کو عجائب گھروں یا چڑیا گھروں کے مانند برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ رہے صوبے اور ان کی حدود اور نام تو ان کے ضمن میں تو ہماری انگریزوں کی وراثت میں سرِ مُو ترمیم یا تبدیلی سے گریز کی انتہاء کا مظہر یہ حددرجہ غیر معقول اور غیر منطقی رویہ ہے کہ ہم نے تاحال صوبۂ سرحد کا نام بھی تبدیل نہیں کیا۔ حالانکہ ''شمال مغربی سرحدی صوبہ'' متحدہ ہندوستان میں تو کسی درجہ درست نام ہو سکتا تھا' پاکستان میں تو یہ نام نہایت نامعقول ہی نہیں حددرجہ مضحکہ خیز بھی ہے۔ اس لئے کہ یہاں تو چاروں صوبے ''سرحدی'' ہیں۔ چنانچہ پنجاب شمال مشرقی سرحدی صوبہ ہے تو سندھ اور بلوچستان علی الترتیب جنوب مشرقی سرحدی صوبے اور جنوب مغربی سرحدی صوبے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور منطق کا کم از کم تقاضا یہ ہے کہ باقی صوبوں کے نام بھی اسی طور سے رکھ دیئے جائیں یا صوبۂ سرحد کو وہاں کے باشندوں کی خواہش کے مطابق پختونستان یا پختون خواہ کا نام دے دیا جائے۔ گویا ''یا چناں کن یا چنیں!''

اسلام اور سماجی انصاف

ایک مکمل نظامِ زندگی کی حیثیت سے اسلام کی اعلیٰ ترین قدر' اس کا آخری ہدف اور اصل مقصود و مطلوب عدلِ اجتماعی یعنی سماجی انصاف یا سوشل جسٹس ہے جس کے تین نمایاں ترین مظاہر ہیں: (۱) سماجی اور قانونی سطح پر کامل مساوات (۲) سیاسی سطح پر حریت اور (۳) معاشی سطح پر عدل و انصاف۔ چنانچہ اسلام ایک ایسا معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے جس میں نہ معاشرتی میدان میں اونچ نیچ اور ادنیٰ و اعلیٰ کا امتیاز ہو' نہ سیاسی میدان میں جبر و استبداد کا راج اور بندہ و آقا' حاکم و محکوم اور مستکبرین اور مستضعفین کی تقسیم ہو' نہ اقتصادی میدان میں انسان ظلم اور استحصال کے باعث Haves اور Have nots یعنی مترفین و محرومین میں منقسم ہوں!

یہاں ایک وضاحت ضروری ہے۔ ہوسکتا ہے کہ بعض حضرات کو خیال آئے کہ اسلام کی اعلیٰ ترین قدر تو تقرب الی اللہ اور تعلق مع اللہ یعنی بندہ اور ربّ کے مابین خلوص و اخلاص اور باہمی محبت و ولایت کا رشتہ ہے! تو اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ واقعہ یہی ہے کہ اسلام انفرادی سطح پر بندۂ مؤمن کو جو بلند ترین نصب العین عطا کرتا ہے وہ رضائے الٰہی اور فلاحِ اُخروی کا حصول ہے' لیکن اس حقیقت سے صرفِ نظر کر لینا بھی شدید قسم کی بے حسی اور ناانصافی ہوگی کہ جس خطۂ ارضی میں نظامِ اجتماعی ظالمانہ اور استحصالی ہو وہاں کے لوگوں کی عظیم اکثریت کولہو کے بیلوں اور بار برداری کے جانوروں کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے اور فرمانِ نبوی ﷺ ((كَادَ الْفَقْرُ اَنْ يَّكُوْنَ كُفْرًا)) یعنی ''قریب ہے کہ فقر و احتیاج کفر کی صورت اختیار کر لیں!'' اور قولِ شاعر ؎

''دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے!''

کے مصداق ان میں نہ اتنا شعور باقی رہ جاتا ہے کہ اپنے خالق و مالک کی معرفت حاصل کرسکیں' نہ اتنی فرصت ہی حاصل ہوتی ہے کہ ؏ ''بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے!'' کے مصداق اُسے یاد کرسکیں یا اس سے لُو لگا سکیں! اس سلسلے میں امام الہند شاہ ولی اللہ

دہلوی کا یہ قول آبِ زر سے لکھنے کے قابل اور لوحِ قلب و ذہن پر نقش کر لینے کا مستحق ہے کہ تقسیم دولت کا غیر منصفانہ نظام ایک دو دھاری تلوار ہے جو معاشرے کو دونوں جانب سے کاٹتی ہے' کیونکہ اس کے نتیجے میں ایک جانب ایک محدود طبقے میں دولت کا ارتکاز ہو جاتا ہے جس سے عیاشی اور بداخلاقی جنم لیتی ہے' اور دوسری جانب فقر و احتیاج کا دَور دَورہ ہو جاتا ہے جس سے انسان ڈھور ڈنگر کی صورت اختیار کر لیتے ہیں! بنا بریں خانقاہی نظام کے برعکس' جو مجاہدۂ نفس اور ریاضت و مراقبہ ہی کو مقصود و مطلوب بنالیتا ہے' اسلام نے اپنا ''ذروۂ سنام'' یعنی چوٹی کا عمل جہاد فی سبیل اللہ کو قرار دیا ہے جس کا اصل ہدف ہے: قیامِ نظامِ عدلِ اجتماعی اور ظلم و جبر اور استحصال اور استبداد کا خاتمہ!!

اسلام میں اس عدلِ اجتماعی یا سماجی انصاف یعنی سوشل جسٹس کو جو اہمیت حاصل ہے اس کا اندازہ اس مسئلے میں قرآن حکیم کی عام تعلیمات پر مستزاد اِن تصریحات کے جائزہ سے آسانی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے جو تین بلند ترین سطحوں یعنی ایمان باللہ' ایمان بالرسالت اور اُمت مسلمہ کے فرائض منصبی کے ضمن میں وارد ہوئی ہیں۔

(۱) اسلام کی اصل اساس ایمان باللہ ہے' اور ایمان باللہ اور معرفت الٰہی کا واحد ذریعہ اللہ کے اسماء و صفات ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے ننانوے اسماءِ حسنٰی کی تفصیل پر مشتمل جو حدیث امام ترمذیؒ اور امام بیہقیؒ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے اس میں اللہ تعالیٰ کا ایک نامِ نامی اور اسم گرامی ''العدل'' بھی ہے' یعنی سراپا عدل اور مجسم انصاف۔ قرآن حکیم میں اگرچہ اللہ تعالیٰ کا یہ نام تو وارد نہیں ہوا' تاہم متعدد مقامات پر اس کی اس شان کا ذکر موجود ہے۔ مثلاً:

(i) ﴿وَاللّٰهُ يَقْضِىْ بِالْحَقِّ ؕ﴾ (المؤمن: ۲۰)

''اور اللہ فیصلہ کرتا ہے حق کے ساتھ۔''

(ii) ﴿وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ؕ﴾ (الانعام: ۱۱۶)

''تیرے ربّ کی بات صدق و عدل کے جملہ معیارات کے مطابق پوری ہو چکی ہے۔''

(iii) ﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَ الْمَلٰۤئِكَةُ وَ اُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ ؕ﴾

(آل عمران: ۱۸)

''خود اللہ بھی گواہ ہے اور سب فرشتے اور تمام اہل علم بھی گواہ ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، جو عدل وانصاف کو قائم کرنے والا ہے۔''

(iv) ﴿إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝﴾ (المائدۃ' الحُجُرات اور الممتحنۃ)

''اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔''

(۲) ایمان باللہ کے بعد درجہ اور مرتبہ ہے ایمان بالرسالت یعنی بعثت انبیاء و رُسل اور انزال کتاب و شریعت پر یقین کا۔ چنانچہ یہ بات بھی قرآنِ حکیم نے نہایت واشگاف الفاظ میں واضح کر دی ہے کہ ان جملہ امور کا اصل مقصد یہ ہے کہ ''انسان عدل وانصاف پر قائم ہوں۔''

اس اہم موضوع پر قرآنِ حکیم کی سب سے زیادہ ''انقلابی آیت'' سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ ہے جس کے بارے میں بلاخوفِ تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ اتنے مختصر الفاظ میں اس قدر جامع اور اتنی بھرپور اور گھمبیر انقلابی عبارت کی کوئی دوسری مثال دنیا کے پورے انقلابی لٹریچر میں کہیں نہیں مل سکتی۔

﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝﴾

اس آیۂ مبارکہ کا ترجمہ بعض تشریحی اضافوں کے ساتھ یوں ہوگا:

''یقیناً ہم نے اپنے رسولوں کو روشن نشانیوں (یعنی معجزات و براہین) کے ساتھ بھیجا اور اُن کے ساتھ اپنی کتاب بھی نازل فرمائی اور میزان بھی' تاکہ لوگ عدل پر قائم ہوں' اور (جو لوگ اس میزانِ عدل کے نصب کرنے میں رکاوٹ بنیں' ان کی سرکوبی کے لئے) ہم نے لوہا اتارا جس میں (حرب وضرب کی) شدید قوّت ہے' اور اس کے ساتھ ساتھ لوگوں کے لئے (کچھ دوسرے) فائدے بھی ہیں۔ اور (اس سے اللہ کا اصل مقصد یہ ہے) تاکہ اللہ (ایمان کا دعویٰ کرنے والوں کو آزمائے اور یہ) دیکھے کہ کون ہیں جو (لوہے کی حربی قوّت کے استعمال کے ذریعے) مدد کرتے ہیں اس کی اور اس کے رسولوں کی غیب میں ہوتے ہوئے' (ورنہ) یقیناً اللہ (خود) نہایت زور آور اور مختارِ مطلق ہے!''

اس آیۂ مبارکہ نے نہایت واشگاف الفاظ میں واضح کر دیا ہے کہ:

اوّلاً: شریعت خداوندی کی اصل حیثیت ایک میزان عدل وقسط کی ہے جس میں انسانوں کے انفرادی اور اجتماعی حقوق وفرائض تولے جانے چاہئیں۔

ثانیاً: بعثت انبیاء ورُسل اور نزولِ وحی وکتب سے آخری مطلوب یہ ہے کہ اللہ کی عطا کردہ میزانِ عدل وقسط بالفعل نصب ہو اور جسے کچھ ملے اس میں تل کر ملے اور جس سے کچھ لیا جائے اس میں تول کر لیا جائے۔ اور اگر یہ مقصد حاصل نہ ہو تو ع ''گر یہ نہیں تو بابا پھر سب کہانیاں ہیں!'' کے مصداق رسولوں کے ساتھ عشق ومحبت کے دعوے باطل اور کتابِ الٰہی کی تلاوت وقراءت کا ذوق وشوق بے مقصد ہو جاتا ہے۔

ثالثاً: اس میزانِ عدل وقسط کو عملاً نصب کرنے کے ضمن میں جہاں اصل کام دعوت وتبلیغ' وعظ وتلقین' انذار وتبشیر اور ترغیب وترہیب سے لیا جائے گا وہاں قوت و طاقت کا استعمال بھی قطعاً غلط یا مطلقاً ناجائز نہیں' بلکہ حسبِ ضرورت نہ صرف جائز بلکہ بعض صورتوں میں فرض اور واجب ہو جاتا ہے۔

رابعاً: جس طرح انسان کی حیاتِ دُنیوی کا اصل مقصد از روئے قرآن ابتلاء و آزمائش ہے' جیسے کہ وارد ہوا سورۃ الملک کی آیت ۲ میں جس کی ترجمانی کی ہے ترجمانِ حقیقت علامہ اقبال نے اپنے اس حکیمانہ شعر میں کہ ؎

''قلزمِ ہستی سے تو ابھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی!''

اسی طرح انبیاء ورُسل کی بعثت اور کتاب وشریعت کے نزول کا مقصد اُن لوگوں کے خلوص اور صداقت کا امتحان ہے جو اللہ اور اُس کے رسولوں پر ایمان کے دعوے دار ہوں کہ آیا وہ اللہ کی عطا کردہ میزانِ عدل کو بالفعل نصب کرنے اور اسلام کے نظامِ عدل وقسط کو عملاً قائم کرنے میں تن من دھن کھپاتے' حتیٰ کہ وقت آنے پر نقدِ جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں آ جاتے ہیں یا نہیں!

خامساً: وہ صاحبِ ایمان جو اِس امتحان میں پورے اتریں اللہ کے نزدیک بلند ترین مقام ومرتبہ کے مستحق ہوں گے' یہاں تک کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے

''مددگار'' قرار پائیں گے۔

قرآن حکیم کے طالب علم جانتے ہیں کہ اس کتاب عزیز کا ایک مستقل اصول یہ ہے کہ اس میں اہم مضامین کم از کم دو مرتبہ ضرور آتے ہیں۔ چنانچہ سورۃ الحدید کی اس آیت ۲۵ کی طرح سورۃ الشوریٰ کی آیت ۱۷ میں بھی کتاب و میزان کا ذکر یکجا وارد ہوا ہے: ﴿اَللّٰهُ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِیْزَانَ ؕ﴾ یعنی ''اللہ وہ ہے جس نے کتاب بھی حق کے ساتھ نازل فرمائی اور میزان بھی!'' اور اس سے قبل آیت ۱۵ میں نبی اکرم ﷺ کی زبانِ مبارک سے ع ''مجھے ہے حکم اذاں لا الٰہ الا اللہ'' کے انداز میں کہلوایا گیا ہے کہ ﴿وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَكُمْ ؕ﴾ یعنی ''مجھے حکم ہوا ہے کہ تمہارے مابین عدل قائم کروں!''... اسی طرح اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نصرت کا ذکر جس انداز میں سورۃ الحدید کی اس آیت کے آخر میں آیا ہے' بالکل اسی طرح سورۃ الصف کی آخری آیت میں بھی وارد ہوا ہے۔ یعنی:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِیْسَى ابْنُ مَرْیَمَ لِلْحَوَارِیّٖنَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ...... ﴾

''اے ایمان والو! اللہ کے مددگار بنو جیسے کہ عیسیٰؑ ابن مریم نے حواریوں سے کہا تھا کہ کون ہے میرا مددگار اللہ کی راہ میں؟ تو حواریوں نے جواب دیا تھا کہ ہم ہیں اللہ کے مددگار!''

مزید برآں یہ حقیقت بھی ذہن میں مستحضر کر لیجئے کہ سورۃ الصف کی مرکزی آیت وہی ہے جس میں نبی اکرم ﷺ کا مقصد بعثت یہ بیان ہوا ہے کہ جو دینِ حق یعنی نظامِ عدل و قسط آپؐ کو دے کر بھیجا گیا ہے اسے پورے نظامِ زندگی پر بالفعل قائم کر دیں۔

(۳) نبی اکرم ﷺ پر نبوت کا سلسلہ ختم ہو جانے کے بعد اب قیامت تک رسالت کے مشن کی تکمیل اور فرائض رسالت کی ادائیگی کی ذمہ داری اُمت مسلمہ پر بحیثیت مجموعی عائد ہو گئی ہے۔ اس کے ضمن میں قرآن حکیم میں جہاں سورۃ الحج کی آخری آیت اور سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۴۳ میں ''شہادت علی الناس'' کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے' اور سورۂ آل عمران کی آیت ۱۰۴ اور ۱۱۰ میں امر بالمعروف اور نہی

عن المنکر کے الفاظ وارد ہوئے ہیں وہاں سورۃ النساء کی آیت ۱۳۵ اور سورۃ المائدۃ کی آیت ۸ میں ذرا سی لفظی ترتیب کے فرق کے ساتھ عدل وقسط کی گواہی اور نظامِ عدل وقسط کو قائم کرنے کے لئے پوری قوت کے ساتھ کھڑے ہوجانے کا تاکیدی حکم دیا گیا ہے۔ چنانچہ سورۃ النساء میں ارشاد ہوا:

﴿یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُھَدَآءَ لِلّٰہِ وَلَوْ عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ...﴾

''اے اہل ایمان! پوری قوت کے ساتھ عدل وقسط کے قائم کرنے والے اور اللہ کے حق میں گواہی دینے والے بنو' خواہ یہ گواہی تمہارے اپنے خلاف جارہی ہو!''

اور سورۃ المائدۃ میں فرمایا:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰہِ شُھَدَآءَ بِالْقِسْطِ ز وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا ط اِعْدِلُوْا قف ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی ز﴾

''اے ایمان والو! پوری قوت کے ساتھ اللہ کے لئے کھڑے ہو جاؤ عدل وقسط کی گواہی دیتے ہوئے' اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرنے پائے کہ تم عدل سے انحراف کرو' ہر حال میں عدل سے کام لو' یہی تقویٰ سے قریب تر ہے!''

(۴) اس مضمون کا نقطۂ عروج یہ ہے کہ قرآن مظلوم اور محروم طبقات کو صرف صبر ہی کی تلقین نہیں کرتا بلکہ انتقام لینے کی اجازت بھی دیتا ہے۔ چنانچہ انفرادی سطح پر تو سورۃ النساء کی آیت ۱۴۸ کے یہ الفاظ کفایت کرتے ہیں کہ:

﴿لَا یُحِبُّ اللّٰہُ الْجَھْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ط﴾

''اللہ کو بُری بات بلند آواز سے کہنا بالکل پسند نہیں' سوائے اس کے جس پر ظلم ہوا ہو!''

اور اجتماعی سطح پر یہ بات نہایت واشگاف الفاظ میں فرمائی گئی ہے سورۃ الشوریٰ کی آیت ۳۹ میں' جہاں ایسے لوگوں کا ذکر مدح وستائش کے انداز میں کیا گیا ہے:

﴿وَ الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْیُ هُمْ یَنْتَصِرُوْنَ۝﴾

''جن پر ظلم اور زیادتی کی جائے تو وہ اس کا بدلہ اور انتقام لیتے ہیں۔''

اور پھر آیات ۴۱ اور ۴۲ میں مزید تصریح کی گئی ہے کہ:

﴿وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِکَ مَا عَلَیْهِمْ مِّنْ سَبِیْلٍ ۝ اِنَّمَا السَّبِیْلُ عَلَی الَّذِیْنَ یَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَیَبْغُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ اُولٰٓئِکَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ۝﴾

''جو کوئی انتقام لیتا ہے اس کے بعد کہ اس پر ظلم کیا گیا ہو تو ایسے لوگوں پر نہ کوئی الزام ہے نہ ملامت۔ الزام اور ملامت کے قابل تو وہ ہیں جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں (یعنی ان کے سماجی' سیاسی اور معاشی حقوق غصب کرتے ہیں) اور زمین میں ناحق سرکشی کرتے ہیں (یعنی مستکبرین اور مترفین کی صورت اختیار کر لیتے ہیں) ایسے ہی لوگوں کے لئے دردناک عذاب ہے!''

ان اختتامی الفاظ میں گویا کہ اشارہ موجود ہے کہ ان ظالموں اور مستکبرین کو آخرت میں تو سزا ملے گی ہی' دُنیا میں بھی نہ صرف یہ کہ ان کے ہاتھ روکنے کی بھرپور سعی ہونی چاہئے بلکہ ضرورت پیش آئے تو سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۷۹ میں وارد شدہ الفاظ ﴿وَلَکُمْ فِی الْقِصَاصِ حَیٰوةٌ یّٰاُولِی الْاَلْبَابِ﴾ یعنی ''اے ہوش مندو! تمہارے لئے قصاص ہی میں زندگی ہے!'' کے مطابق ایسے لوگوں کو بھرپور سزا دینے حتیٰ کہ ان کی سرکوبی کرنے سے بھی گریز نہیں کیا جانا چاہئے!

حاصل کلام یہ ہے کہ بحیثیت دین' اسلام کی اعلیٰ ترین قدر سماجی اور تمدنی انصاف ہے اور اقامت دین یعنی اسلامی انقلاب کا اصل ہدف یہ ہے کہ اللہ کا عطا کردہ متوازن اور معتدل نظامِ عدلِ اجتماعی (سسٹم آف سوشل جسٹس) قائم کیا جائے۔

آخر میں عربی زبان کے اس مقولے کے مطابق کہ ''اَلْفَضْلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْاَعْدَاءُ'' یعنی ''اصل فضیلت اور خوبی وہ ہے جس کا اعتراف دشمن بھی کریں'' ایک شاتم رسولؐ کی گواہی پیش کرنا چاہتا ہوں۔ میری مراد ایچ جی ویلز سے ہے جس نے نبی اکرم ﷺ کی ذاتی اور ازدواجی زندگی پر نہایت رکیک حملے کئے ہیں' لیکن اس نے بھی

اپنے آپ کو اس عدلِ اجتماعی کے حوالے سے نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں شاندار ہدیۂ تحسین پیش کرنے پر مجبور پایا۔ چنانچہ اپنی تالیف "A Concise History of the World" میں آنحضور ﷺ کے خطبہ حجۃ الوداع کے کچھ حصے نقل کرنے کے بعد اس نے لکھا:

''انسانی حریت، اخوت اور مساوات کے وعظ تو دنیا میں پہلے بھی بہت کہے گئے تھے، چنانچہ مسیح ناصری کے یہاں بھی وہ بکثرت موجود ہیں، لیکن اس حقیقت کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں ہے کہ ان اصولوں پر بالفعل ایک معاشرہ تاریخ انسانی میں پہلی بار قائم کیا محمد (ﷺ) نے''۔

(نوٹ: ایچ جی ویلز کی یہ عبارت اس کتاب کے نئے ایڈیٹروں نے تازہ ایڈیشن سے حذف کر دی ہے، لیکن بڑی لائبریریوں میں وہ پرانے ایڈیشن دستیاب ہیں جن میں یہ الفاظ موجود ہیں!)

ساتھ ہی شدید حسرت کے ساتھ یہ عرض کئے بغیر نہیں رہا جا رہا کہ معمارِ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے بھی حصولِ پاکستان کے اصل مقصد کی وضاحت کے لئے یہی الفاظ استعمال کئے تھے کہ: ''ہم پاکستان اس لئے حاصل کرنا چاہتے ہیں کہ عہد حاضر میں اسلام کے اصولِ حریت و اخوت و مساوات کا ایک عملی نمونہ دنیا کے سامنے پیش کر سکیں''۔ اور ۱۹۳۰ء کے خطبہ الٰہ آباد میں مصورِ پاکستان علامہ محمد اقبال نے بھی اپنی اس پیشینگوئی کے ساتھ کہ ''ہندوستان کے شمال مغربی علاقوں پر مشتمل ایک آزاد مسلمان ریاست کا قیام تقدیرِ الٰہی ہے'' یہی فرمایا تھا کہ ''اگر ایسا ہو گیا تو ہمیں ایک موقع مل جائے گا کہ اسلام کی حقیقی تعلیمات کے چہرۂ روشن پر جو پردے عرب ملوکیت کے دَور میں پڑ گئے تھے انہیں ہٹا کر اسلام کا اصل روئے انور دنیا کو دکھا سکیں!'' ...

لیکن افسوس صد افسوس، کہ قیامِ پاکستان کے نصف صدی بعد بھی ہنوز روزِ اوّل والا معاملہ ہے اور اس سمت میں کوئی پیش قدمی نہیں ہو سکی... کاش! اے کاش! کہ غ ''کبھی بھولی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو!'' کے مصداق ملت اسلامیہ پاکستان اب بھی اپنے اصل ہدف کی طرف بڑھنے کا عزم مصمم کر لے... آمین! وَمَا ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیْزٍ!

پاکستان میں سماجی انصاف کا اوّلین تقاضا

ایک نیا اور منصفانہ بندوبست اراضی

جیسے کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے' سماجی انصاف کا مفہوم بہت وسیع ہے اور اس کے متعدد پہلو ہیں' جن کے اپنے اپنے جداگانہ تقاضے ہیں۔

مثلاً خالص سماجی اور معاشرتی سطح پر انصاف کا اہم ترین تقاضا یہ ہے کہ تمام انسانوں کو پیدائشی طور پر مساوی تسلیم کیا جائے اور ان کے مابین اونچ نیچ کا کوئی فرق اور اعلیٰ وادنیٰ کا کوئی امتیاز اُن چیزوں کی بنیاد پر نہ ہو جو انہیں پیدائشی طور پر ملتی ہیں' لہٰذا ان کے ضمن میں کسی انتخاب واختیار یا کسب وسعی کا سوال نہیں ہوتا' جیسے نسل' رنگ اور جنس۔ گویا انسانوں کے مابین کوئی فرق وتفاوت اور درجہ بندی صرف ان امور کی بنیاد پر ہو سکتی ہے جن میں اُن کے کسب واختیار اور سعی وجہد کو دخل حاصل ہے' جیسے نظریات و عقائد' یا سیرت وکردار' یا علم وہنر وغیرہ۔ پھر یہ درجہ بندی بھی خالص انتظامی حیثیت کی حامل ہو گی' شرفِ انسانیت کو پوری نوعِ انسانی کی مشترکہ اور مساویانہ متاع کی حیثیت حاصل رہے گی' اور اس اعتبار سے تمام انسان ہر صورت میں بالکل مساوی اور برابر متصور ہوں گے!

اسی طرح سیاسی سطح پر سماجی انصاف کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ ہر انسان کو بنیادی طور پر آزاد تسلیم کیا جائے۔ جیسے کہ امیر المؤمنین اور خلیفۂ ثانی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایران کے فاتح اور گورنر حضرت سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو مکان کے آگے ڈیوڑھی بنانے اور دربان کھڑا کرنے پر سرزنش کے طور پر تحریر فرمایا تھا: ''اے سعدؓ! لوگوں کو ان کی ماؤں نے آزاد جنا تھا' تم نے انہیں اپنا غلام کب سے بنا لیا؟'' —— پھر اسی اصول کا ایک منطقی تقاضا یہ بھی ہے کہ یہ تسلیم کیا جائے کہ افراد کی آزادی پر صرف وہ

قدغنیں اور پابندیاں عائد کی جا سکتی ہیں جو یا تو ان کے خالق اور مالک نے عائد کی ہوں' یا ان کے طے کرنے میں ان کی اپنی رائے اور مشورے کو بھی دخل حاصل ہو۔ اور اس طرح ''حق خود اختیاری'' کا تقاضا پورا ہو جائے! الغرض' سیاسی سطح پر سماجی انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ع ''تمیز بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے!'' کے مطابق انسانوں کے مابین حاکم و محکوم اور قرآن حکیم کی اصطلاح میں ''مستکبرین'' اور ''مستضعفین'' کی تقسیم و تفریق باقی نہ رہے' بلکہ سیاسی اعتبار سے کامل مساوات قائم ہو جائے اور حدیث نبوی ﷺ کے الفاظ کے مطابق ''سب انسان اللہ کے بندے اور آپس میں بھائی بھائی بن جائیں۔''

سماجی انصاف کے یہ دونوں پہلو جو اوپر بیان ہوئے' نہایت اہم ہیں' بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اصل بنیادی حیثیت اور اساسی اہمیت ان ہی کو حاصل ہے۔ مزید برآں ''مساوات'' کے لفظ کا صحیح اور کامل اطلاق بھی صرف ان ہی دونوں سطحوں پر کیا جا سکتا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ عہد حاضر میں ان دونوں کی حیثیت ثانوی ہو کر رہ گئی ہے اور مشین کی ایجاد کے بعد سماجی انصاف کے ضمن میں اوّلین اہمیت معاشی عدل اور اقتصادی انصاف کو حاصل ہو گئی ہے۔ چنانچہ تاریخ انسانی کے موجودہ دَور کے بارے میں بجا طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ یہ اصلاً معاشیات اور اقتصادیات کا دَور ہے' اور عہد حاضر کا انسان فی الواقع ''معاشی حیوان'' بلکہ صحیح تر الفاظ میں مشین کے مانند صرف ایک ''ذریعۂ پیداوار'' بن کر رہ گیا ہے۔ یہاں تک کہ آج عظیم ترین سلطنتوں اور ''سپر پاورز'' کا درجہ رکھنے والی حکومتوں کی بلند ترین سطح کی پالیسیاں بھی بنیادی طور پر معاشی مفادات اور اقتصادی مصلحتوں ہی کی بنیاد پر طے ہوتی ہیں ـــــ لہٰذا عہد حاضر میں سماجی انصاف کا اوّلین اور اہم ترین تقاضا معاشی عدل اور اقتصادی انصاف ہے۔ یہاں تک کہ اگر کسی معاشرے میں معاشی عدل و قسط کا فقدان ہو' اور اقتصادی میدان میں ظلم اور استحصال کی بھٹی گرم ہو' اور انسان قرآن کی اصطلاح میں ''مترفین'' اور ''محرومین'' کے طبقات میں تقسیم ہو کر رہ گئے ہوں تو وہاں خواہ ''حریت' اخوت اور

مساوات'' کے کتنے ہی راگ الاپے جائیں یا وعظ کہے جائیں' اور بالغ رائے دہی کی بنیاد پر جمہوریت کے کیسے ہی سوانگ رچا لئے جائیں' حقیقت کے اعتبار سے وہاں کا پورا جتماعی نظام ''مراعات یافتہ طبقات کی آمریت'' کی صورت اختیار کر لے گا اور سماجی و معاشرتی اور سیاسی وریاستی انصاف کے تمام دعوے باطل اور کھوکھلے قرار پائیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ ترجمانِ حقیقت علامہ اقبال مرحوم نے مغربی جمہوریت کا تجزیہ یا پوسٹ مارٹم ان تیکھے ہی نہیں تلخ الفاظ میں کیا ہے۔

تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن' اندروں چنگیز سے تاریک تر!

اور ۔

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری!

اور واقعہ یہ ہے کہ یہ الفاظ نہ محض لفاظی کے مظہر ہیں نہ مبالغہ آرائی کے' بلکہ ۔

اے اہل نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا!

کے مصداق صد فی صد حقیقت بنی اور صدق بیانی پر مبنی ہیں۔ اس لئے کہ وہاں سرمایہ دارانہ معیشت اور سود' جوئے اور سٹے پر مبنی اقتصادی نظام نے کروڑ پتی اور ارب پتی سرمایہ داروں کا ایک محدود طبقہ پیدا کر دیا ہے اور ملکی سیاست ان کی زر خرید لونڈی بن کر رہ گئی ہے۔ یا بالفاظ دیگر اس نے اس محدود طبقے کے مشغلے اور فٹ بال یا والی بال کے سے کھیل کی صورت اختیار کر لی ہے۔ چنانچہ یہ وہ مکروہ اور گھناؤنی حقیقت ہے جس پر ''بنیادی انسانی حقوق'' اور ''حقوقِ شہریت'' کا رنگ وروغن مَل دیا گیا ہے' اور حریت فکر وعمل' آزادئ اظہار رائے اور بالغ رائے دہی پر مبنی ''جمہوریت'' کے حسین نقش و نگار بنا دیئے گئے ہیں!

چنانچہ اسی گندم نمائی اور جو فروشی کا ردِّ عمل تھا جو کمیونزم کی صورت میں ظاہر ہوا۔

لیکن چونکہ اس نے ''ردِّعمل'' کی فطری انتہا پسندی کے جوش میں انفرادی ملکیت کی کامل نفی کر دی جس سے انسان کی حیوانی جبلت کے ایک اہم تقاضے کی نفی ہو گئی' لہٰذا وہ بہت جلد ناکام ہو کر ع ''خوش درخشید' و لے شعلۂ مستعجل بود!'' کی نمایاں مثال بن کر رہ گیا۔ اس لئے کہ شیخ سعدیؒ کے اس قول کے مطابق کہ ؎

''آدمی زادہ طرفہ معجون است
از فرشتہ سرشتہ وز حیوان!''

انسانی شخصیت میں جہاں ایک فرشتہ خصلت روحانی عنصر بھی شامل ہے' وہاں جملہ حیوانی جبلتوں کا حامل ''حیوانِ کامل'' بھی موجود ہے' جس کے کسی اساسی تقاضے کی کلی نفی فطرت سے جنگ کے مترادف ہے' جس میں کامیابی کا کوئی امکان نہیں! بہرحال کمیونزم کی اس شکست کے نتیجے میں اس وقت مغربی سرمایہ دارانہ جمہوریت کا عفریت فاتحانہ انداز کی شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ ''نیو ورلڈ آرڈر'' کی صورت میں عالمی غلبے کے ذریعے پورے عالم انسانی کو اپنے استحصالی جال میں جکڑنے کے لئے فیصلہ کن اقدام کے لئے پر تول رہا ہے! اور اگرچہ ہمارا ایمان ہے کہ بالآخر تو ''جَـاءَ الْـحَـقُّ وَ زَهَـقَ الْبَـاطِـلُ'' کی الٰہی تقدیر اور خدائی فیصلے ہی کا ظہور ہو گا اور تمام روئے ارضی پر ''خلافت علیٰ منہاج النبوۃ'' کا نظامِ عدل و قسط ہی قائم ہو گا' تاہم فی الوقت پوری دنیا میں ایسی کوئی طاقت نظر نہیں آ رہی جو اِس شیطانی منصوبے کی راہ میں فیصلہ کن طور پر مزاحم ہو سکے۔ لیکن چونکہ علامہ اقبال کی ''اطلاع'' کے مطابق تو اب سے نصف صدی قبل ہی ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' کی قرارداد یہ تھی کہ ؎

جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایام ہے   مزدکیت فتنۂ فردا نہیں' اسلام ہے!

لہٰذا اس کے باوجود کہ ابھی پوری زمین کے کسی ایک انچ رقبے پر بھی کہیں اسلام کا نظامِ عدلِ اجتماعی قائم نہیں ہو سکا' اور سماجی انصاف کا اسلامی تصور تاحال ''مسلمانی در کتاب'' کے مصداق یا تو صرف طاقِ تصور و تخیل کی زینت ہے' یا زیادہ سے زیادہ صرف لکھے ہوئے یا بولے ہوئے حروف و الفاظ کی صورت میں موجود ہے' عالمی ذرائع

ابلاغ کے شیطانی آلہ ہائے نشر و اشاعت نے حفظ ماتقدم کے طور پر ''اسلامک فنڈا منٹلزم'' کی دہائی نہایت زور و شور کے ساتھ دے رکھی ہے جس کے متوقع یا ''قابل حذر'' مراکز کی فہرست میں پاکستان کا نام بھی شامل ہے! (اور اگرچہ پاکستان کے عام انتخابات کے نتائج سے عالمی شیطانی قوتوں کو کم از کم وقتی طور پر کچھ اطمینان حاصل ہو گیا ہے' تاہم جو لوگ ''باطن ایام'' پر نگاہ رکھتے ہیں' اور ع ''سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف!'' کے مصداق قرآن حکیم اور احادیث رسول اللہ ﷺ کی دو آنکھوں سے حقائق باطنی کو دیکھنے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہیں' وہ جانتے ہیں کہ ''خلافت علیٰ منہاج النبوۃ'' کی صورت میں اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی یعنی سماجی انصاف کے کامل اور متوازن نظام کے قیام کا نقطۂ آغاز بننے کی سعادت ان شاء اللہ اسی سلطنت خداداد پاکستان اور اس سے ملحق سرزمین افغانستان کو حاصل ہوگی جسے دورِ نبویؐ میں خراسان کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ واللہ اعلم!!)

بہر حال اس عالمی تناظر کے پیش نظر اور اس زمان و مکان کے فریم ورک کے پس منظر میں پاکستان کے معروضی حالات کا مطالعہ اور مشاہدہ کیا جائے تو یہ حقیقت کبریٰ فوری طور پر اظہر من الشمس کی طرح سامنے آتی ہے کہ اگرچہ مغربی سرمایہ دارانہ معیشت اور سود' جوئے اور سٹے کے تانے بانے والا مغربی اقتصادی نظام بھی ہمارے ملک میں بدترین اور مکروہ ترین صورت میں رائج ہے' جس کے نتیجے میں یہاں بھی چند ہزار خاندان ایسے وجود میں آ چکے ہیں جن پر قرآنی اصطلاح ''مترفین'' کا اطلاق کیا جا سکتا ہے' جو سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۱۶ اور ۲۷ کے مطابق فسق و فجور' اسراف و تبذیر اور عیاشی و فحاشی کی صورت میں اپنا روایتی کردار ''باحسن وجوہ'' ادا کر رہے ہیں (یعنی: ''جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کر لیتے ہیں تو اس کے مترفین کو چھوٹ دے دیتے ہیں کہ اس میں فسق و فجور کا بازار گرم کر دیں۔ اس کے نتیجے میں وہ بستی اللہ کے قانونِ عذاب کی زد میں آ جاتی ہے۔ چنانچہ ہم اسے نیست و نابود کر دیتے ہیں!'' اور ''یقیناً محض نام و نمود اور نمائش کے لئے دولت کو اڑانے والے شیطانوں کے بھائی

ہیں!'')____ تاہم کوآپریٹوسکینڈلوں اور دیگر مالیاتی اداروں کی لوٹ کھسوٹ سے قطع نظر، مجموعی نسبت وتناسب کے اعتبار سے تاحال پاکستانی معاشرے میں سرمایہ دارانہ طرزِ استحصال کے مقابلے میں زمیندارانہ ظلم و جور اور جاگیردارانہ زراعت اور مزارعت کے ''طریق واردات'' سے ہونے والے جبر واستحصال کی مقدار بہت زیادہ ہے____ لہٰذا یہاں کسی ''سماجی انصاف'' کا کوئی تصور تک نہیں کیا جاسکتا جب تک جاگیرداری اور زمین داری کے موجودہ نظام کوختم کر کے ایک بالکل نئے اور منصفانہ بندوبست اراضی کی صورت پیدا نہ کی جائے۔ اس لئے کہ جب تک یہ نظام موجود ہے اور ستر پچھتر فیصد انسان جاگیرداروں، وڈیروں، بڑے زمین داروں اور قبائلی سرداروں کے زیرنگین ہیں دستورِمملکت میں درج حقوقِ شہریت بالکل بے معنی ہیں (اس لئے کہ ان سے بالفعل صرف بڑے شہروں میں آباد اقل قلیل اقلیت ہی فائدہ اٹھاسکتی ہے!) اور نام نہاد بالغ رائے دہی کی اساس پرخواہ کتنے ہی غیر جانبدارانہ اور منصفانہ انتخابات کا ڈھونگ رچالیا جائے ان پرمبنی جمہوریت فی الحقیقت جاگیرداروں کی آمریت کے سوا کچھ نہیں ہوگی!

چنانچہ یہ اسی عریاں حقیقت کا ادراک واعتراف تھا جس کے نتیجے میں یہاں دو بار نام نہاد ''زرعی اصلاحات'' کا ڈول ڈالا گیا۔ لیکن چونکہ ''قوّت کا اصل سرچشمہ'' جاگیردار ہی تھے، اور ظاہر ہے کہ ان سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اسی شاخ کو کاٹ ڈالیں گے جس پر ان کا اپنا آشیانہ اور ان کے مفادات ومراعات کا کامل دارومدار ہے، لہٰذا دونوں بار کی نام نہاد ''اصلاحات'' سنار کی کھٹ کھٹ سے زیادہ ثابت نہیں ہوئیں، چنانچہ جاگیردارانہ اور زمیندارانہ استحصالی نظام، علیٰ حالہ اور جوں کا توں قائم ہے، جس کے نتیجے میں ع ''الیکشن، ممبری، کرسی، صدارت'' کا پورا سلسلہ، صرف ایک سرمایہ دار خاندان کے علاوہ کلیتہً جاگیرداروں، وڈیروں اور قبائلی سرداروں کا میوزیکل چیئرز کا کھیل بنا ہوا ہے۔ اور اس کے باوجود کہ عوام کے ہاتھوں میں ''ووٹ'' نام کی ایک شے موجود ہے، درحقیقت اور فی الاصل ان کی حیثیت وہی ہے جو میر کے اس شعر میں بیان

ہوئی کہ ؎

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
جو چاہیں سو آپ کرے ہیں' ہم کو عبث بدنام کیا!

پاکستان کی چھیالیس سالہ تاریخ کے دوران میں تین اشخاص ایسے برسر اقتدار آئے جو اگر چاہتے تو پاکستانی معاشرے سے اس لعنت کا خاتمہ کر سکتے تھے' اس لئے کہ وہ فی الواقع اس پوزیشن میں تھے کہ اگر دل سے چاہتے تو ظلم و استحصال کے اس مکروہ ترین نظام کی جڑوں پر کاری وار کر کے سماجی انصاف کی راہ ہموار کر دیتے۔ ان میں سے دو تو فوجی حکمران تھے' یعنی مرحوم صدر ایوب خان اور مرحوم صدر ضیاء الحق' جن کے لئے اس میدان میں کوئی فیصلہ کن اقدام اس اعتبار سے بھی آسان تھا کہ فوجی حکمرانوں کے پاس اختیارات نہایت وسیع' بلکہ بعض اوقات ''لامحدود'' ہوتے ہیں' اور ذاتی طور پر اس لئے مزید آسان تر تھا کہ وہ دونوں نہ جاگیردار تھے نہ بڑے زمین دار' اور تیسرے مرحوم ذوالفقار علی بھٹو تھے جو اگرچہ خود بڑے جاگیردار تھے لیکن ایک ایسی عوامی تحریک کے نتیجے میں برسر اقتدار آئے تھے جو سوشلزم کے نعرے کی بنیاد پر چلائی گئی تھی۔ مزید برآں' ان کے اقتدار کا اصل دَور بھی ''مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر'' ہی کی حیثیت سے شروع ہوا تھا۔ لیکن افسوس' صد افسوس کہ یہ تینوں اس معاملے میں کسی جرأت رندانہ سے کام نہیں لے سکے۔

ان میں سے جہاں تک سابق صدر ایوب خان کا تعلق ہے' ان کے دَور میں جو زرعی اصلاحات ہوئیں ان سے جاگیردارانہ اور زمیندارانہ استحصال کو تو کوئی نمایاں ضعف نہیں پہنچا' البتہ ملک و قوم کی بہی خواہی میں انہوں نے معاشرے کو صنعتی ترقی کی جس راہ پر ڈالا وہ چونکہ مغرب کی سرمایہ دارانہ معیشت ہی کی نقالی کی حیثیت رکھتی تھی لہٰذا اس سے جاگیردارانہ ظلم و جور پر مستزاد سود' جوئے اور سٹے پر مبنی سرمایہ دارانہ استحصال کا اضافہ ہو گیا۔

البتہ ایوب خان مرحوم کے مقابلے میں ضیاء الحق مرحوم کا معاملہ اس اعتبار سے

زیادہ قابل افسوس ہے کہ انہوں نے تحریک نظامِ مصطفیٰ ﷺ کے عروج کے موقع پر زمامِ حکومت ہاتھ میں لی تھی۔ چنانچہ اس وقت مسلمانانِ پاکستان کا دینی و مذہبی جذبہ تحریکِ پاکستان کے آخری ایام کے مقابلے میں بھی کہیں زیادہ قوی تھا۔ اس طرح گویا انہیں تاریخ نے ایک عظیم موقع عطا کیا تھا کہ اگر وہ چاہتے تو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے مقام اور مرتبے تک رسائی حاصل کر لیتے۔ اور یاد ہو گا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے، جنہیں پانچواں خلیفۂ راشد تسلیم کیا جاتا ہے، عنانِ خلافت ہاتھ میں لیتے ہی پہلا کام یہ کیا تھا کہ ان کے پیش رو حکمرانوں نے جو جاگیریں اپنے رشتہ داروں یا خدمت گاروں کو عطا کی تھیں ان سب کی دستاویزات منگوا کر پھاڑ ڈالیں اور اس طرح اس جاگیردارانہ نظام کی جڑیں ایک بار تو بالکل ہی کاٹ ڈالیں جو خلافت راشدہ کے اختتام کے بعد اس دَورِ ملوکیت میں جڑ پکڑنے لگا تھا جسے نبی اکرم ﷺ نے ایک حدیث مبارک (احمد بن حنبلؒ عن نعمان بن بشیرؓ) میں ''کاٹ کھانے والی'' یعنی ظالم و جابر حکومت سے تعبیر فرمایا ہے۔ لیکن افسوس صد افسوس کہ مرحوم جنرل ضیاء الحق پاکستان کے موجودہ جاگیردارانہ نظام کی جڑیں تو کیا کاٹتے، میری اس تجویز پر بھی عمل نہ کر سکے (جو میں نے ان کی مجلس شوریٰ میں پیش کی تھی) کہ جید علماء دین اور ماہرین بندوبست اراضی کا ایک کمیشن قائم کیا جائے جو پاکستان کے موجودہ نظامِ اراضی پر تنقیدی اور تحقیقی نظر ڈال کر شریعت اسلامی کے اصل مقاصد اور روحِ عصر کے اہم تقاضوں کو مدّنظر رکھتے ہوئے پاکستان کے لئے ایک ایسا ''نیا بندوبست اراضی'' تجویز کرے جس سے ملک و قوم کو سماجی انصاف سے ہمکنار کیا جا سکے!

اسی طرح ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کو بھی تاریخ نے ایک عظیم موقع عطا فرمایا تھا کہ اگر وہ چاہتے تو پاکستان کے ماؤزے تنگ بن سکتے تھے۔ اس لئے کہ انہوں نے اسلامی سوشلزم کا نعرہ لگا کر عوام کو اپنے گرد جمع کیا تھا۔ اور اگرچہ مذہبی جماعتوں کی اکثریت نے ان کی مخالفت کی تھی، لیکن ایک اہم اور مؤثر و منظم مذہبی جماعت یعنی جمعیت علماءِ اسلام نے ان کا ساتھ بھی دیا تھا۔ (واضح رہے کہ اُس وقت جمعیت علماء اسلام آج

کے مقابلے میں کہیں زیادہ طاقت ور اور نسبتاً زیادہ وسیع اور عمیق سیاسی اثر و رسوخ کی حامل تھی!) اور ان سطور کے حقیر و عاجز راقم نے بھی ''میثاق'' کے ادارتی صفحات میں ان لوگوں کی مذمت کرتے ہوئے جو ''اسلامی جمہوریت'' کے تو دل و جان سے قائل ہی نہیں فدائی تھے' لیکن ''اسلامی سوشلزم'' کو کفر قرار دیتے تھے' مفصل تحریریں شائع کی تھیں کہ اگرچہ اسلامی نظام بجائے خود ایک حیاتیاتی وحدت ہے جس میں کسی دوسرے ازم کی پیوند کاری نہیں ہو سکتی' چنانچہ اس کی اپنی جمہوریت اور شورائیت اور اسی طرح نظامِ عدل معاشی ہے' تاہم اگر اسلامی جمہوریت کی اصطلاح درست ہے تو یقیناً اسلامی سوشلزم کی اصطلاح بھی صحیح اور مطابق اسلام ہے۔ لیکن افسوس صد افسوس کہ ذوالفقار علی بھٹو بھی اپنی جاگیردارانہ کھال یا خول سے باہر نہ آ سکے۔ چنانچہ انہوں نے ملوں اور کارخانوں' یہاں تک کہ آٹے اور چاول کے چھوٹے چھوٹے صنعتی یونٹوں کو تو نیشنلائز کیا' لیکن زمین کو ''قومیانے'' کی ہمت نہ کر سکے جو ہماری قومی معیشت کی اصل اساس اور ہمارے معاشرے میں ظلم و جور اور جبر و استحصال کی سب سے بڑی بنیاد ہے!

بہرحال آج (۱) جبکہ پاکستانی سیاست کی گاڑی کے دونوں پہیے بھی کسی حد تک روایتی پٹڑی پر چڑھ گئے ہیں' چنانچہ ایک جانب حکومت بھی خاصی مستحکم ہے تو دوسری جانب اپوزیشن بھی خاصی مضبوط ہے' مزید برآں ایک جانب ذوالفقار علی بھٹو کی بیٹی' جو اپنے والد کی نظریاتی وراثت کی دعوے دار ہے' وزیراعظم ہے' تو دوسری جانب ایک ایسا شخص صدرِ مملکت کے عہدے پر فائز ہے جو نہ صرف یہ کہ عوامی سیاست کی سختیاں جھیل کر' اور سیاسی وابستگی میں پائیداری اور استقلال کا ثبوت دے کر اس مقام تک پہنچا ہے' بلکہ شرافت اور لیاقت کے ساتھ ساتھ ذاتی نیکی اور سادگی ہی نہیں' مشرقی اور مذہبی مزاج کے حامل ہونے کی شہرت رکھتا ہے' یہ پھر ایک سنہری موقع ہے کہ پاکستانی معاشرے سے جبر' ظلم اور استحصال کی سب سے بڑی بنیاد کو منہدم کرنے کے بارے میں سنجیدگی سے غور کیا جائے ـــــ اور جاگیرداری اور زمینداری کے موجودہ نظام کا ایک

---

(۱) واضح رہے کہ یہ تحریر اواخر ۱۹۹۳ء کی ہے۔

جانب دین و شریعت کے بنیادی مقاصد اور اصل اہداف کے اعتبار سے جائزہ لیا جائے کہ دین کے اعتبار سے حق و باطل اور شریعت اسلامی کی رو سے جائز و ناجائز میں صحیح امتیاز کیا جا سکے' اور دوسری جانب سماجی انصاف کے تقاضوں کے اعتبار سے بھی غور کیا جائے کہ کون سا راستہ عوام کی بہبود اور ملک و قوم کی خوشحالی' مضبوطی اور ترقی کے نقطۂ نگاہ سے صحیح اور مفید ہے اور کون سا غلط اور مضر —— اور پھر کیا عجب کہ ہمیں یہ دونوں تقاضے متحد اور یکجا نظر آئیں ۔ اس لئے کہ اسلام دین فطرت ہے اور اگرچہ افراد کی سطح پر اس کے نزدیک اصل نصب العین اور مقصد اعلیٰ اللہ کی رضا اور اُخروی فلاح ہے' لیکن دنیا میں اس کا اصل ہدف عدل و قسط کے نظام کا قیام ہے ۔ (جس کی مفصل وضاحت صفحاتِ گزشتہ میں ہو چکی ہے!)

اس ضمن میں ایک عملی مشکل دَورِ ملوکیت میں پروان چڑھنے والی فقہ کے بعض فتاویٰ کی صورت میں بھی موجود ہے' جس کا ایک اہم مظہر سپریم کورٹ کے شریعت اپیلیٹ بنچ کے ایک فیصلہ کی صورت میں سامنے آیا تھا ۔ چنانچہ اس کے حل کے لئے بائیں بازو کے ہمارے بعض دانشور کبھی مارکس اور اینجلز کے ''عمرانی انکشافات' کا سہارا لیتے ہیں (روس میں کمیونزم کی موت واقع ہو جانے کے بعد بھی ان حضرات کی یہ ''وفاداری بشرطِ استواری'' واقعتاً قابل داد ہے!) اور کبھی علامہ اقبال کے اشعار اور ڈاکٹر علی شریعتی کے افکار کا حوالہ دیتے ہیں' حالانکہ ؎

''خوشتر آں باشد مسلمانش کنی
کشتۂ شمشیر قرآنش کنی!''

کے مصداق اس کا کامل حل ''شمشیر قرآنی'' ہی کے حوالے سے دورِ خلافت راشدہ کے عہد فاروقیؓ کے ایک اجتہاد و اجماع میں موجود ہے' جس پر مفصل گفتگو ان شاء اللہ آئندہ صفحات میں ہوگی!

مسئلہ ملکیت زمین

یہ بات تو پاکستان کا ہر عاقل و بالغ شہری' اور ہر صاحب دانش و بینش انسان جانتا ہے کہ جب تک یہاں سے جاگیرداری اور بڑی زمینداری کا خاتمہ نہیں ہوتا نہ یہ ملک ترقی کر سکتا ہے' نہ یہاں عوامی فلاح و بہبود کا مقصد حاصل ہو سکتا ہے' اور نہ ہی حقیقی معنی میں عوامی سیاست جڑ پکڑ سکتی ہے۔ لیکن اصل سوال یہ ہے کہ جاگیرداروں سے ان کی جاگیریں اور بڑے زمینداروں سے ان کی فاضل زمینیں کس اصول کے تحت واپس لی جائیں؟ اس لئے کہ خواہ کسی اور معاملے میں یہاں جائز و ناجائز اور حلال و حرام کا سوال نہ اٹھایا جاتا ہو' اور شریعت اسلامی کے اوامر و نواہی کو پوری شانِ استغناء کے ساتھ نظر انداز کر دیا جاتا ہو' جب بھی جاگیرداری اور زمینداری کا مسئلہ سامنے آتا ہے فوراً شریعت کی ڈھال سامنے کر دی جاتی ہے اور اصولِ ملکیت اور اس کے جملہ لوازم کے ضمن میں اسلام کے خالص فقہی تصورات کی پناہ لے لی جاتی ہے۔

چنانچہ بعض لوگوں کو یہ تک کہنے کا موقع مل جاتا ہے کہ اصل میں پاکستان بنایا ہی نوابوں' وڈیروں' جاگیرداروں اور بڑے زمینداروں نے تھا' اور ان کے پیش نظر قیامِ پاکستان سے صرف اپنے مفادات اور اپنی مراعات کے تحفظ کا مقصد تھا جو تا حال باحسن وجوہ پورا ہو رہا ہے۔ اس لئے کہ انڈین نیشنل کانگریس ایک جانب خود بھی عوامی جماعت تھی' اور دوسری جانب اس کی قیادت پر سوشلزم کے نظریات اور تصورات کا غلبہ تھا' جبکہ مسلم لیگ بنیادی طور پر نوابوں اور نواب زادوں اور ''سروں'' اور خان بہادروں کی جماعت تھی' جنہوں نے اسلام کے نعرے کو صرف اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر استعمال کیا۔ چنانچہ نتیجہ بھی عملی طور پر یہی نکلا کہ بھارت میں زمینداری آزادی کے فوراً بعد ختم کر دی گئی' جبکہ پاکستان میں فیوڈل لارڈز تا حال کوس لمن الملک

بجا رہے ہیں۔

تو اگرچہ ان لوگوں کا یہ نظریہ تاحال تو ''مطابق واقعہ'' ہونے کی بناء پر بظاہر بہت درست نظر آتا ہے' لیکن اس کی جڑ ایک تو اس حقیقت واقعی سے کٹ جاتی ہے کہ نہ مصور ومفکر و مجوز پاکستان علامہ اقبال جاگیردار یا زمیندار تھے' نہ ہی بانی ومعمار ومؤسس پاکستان محمد علی جناح اس طبقے سے تعلق رکھتے تھے' دوسرے ان شاءاللہ مستقبل ثابت کر دے گا کہ پاکستان کا قیام مشیت الٰہی میں پوری نوع انسانی کے سامنے اسلام کے سماجی انصاف' اور عدل وقسط پر مبنی اجتماعی نظام کا ایک نمونہ پیش کرنے کے لئے عمل میں آیا ہے' اور ان شاءاللہ جلد ہی اس ''راہی'' کو اپنی ''بھولی ہوئی منزل'' یاد آ جائے گی اور یہ ''بھٹکا ہوا آہو'' بالآخر ''سوئے حرم'' روانہ ہو جائے گا! اللّٰھم آمین!

تاہم اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ وہ سوال جس کا تذکرہ اوپر کیا گیا ہے' پہلے بھی محض خیالی یا وہمی نہیں تھا' بلکہ واقعی اور حقیقی تھا' اور ۱۹۹۰ء میں سپریم کورٹ آف پاکستان کے شریعت اپیلیٹ بینچ نے جو فیصلہ قزلباش وقف وغیرہ بنام چیف لینڈ کمشنر پنجاب وغیرہ نامی اپیل میں دیا تھا' اس نے تو اس سوال کو ہزار گنا زیادہ اہم بنا دیا ہے اور اگر اس مشکل کا کوئی حل تلاش نہیں کیا جاتا تو اس سے آئندہ کسی بھی نوعیت کی ادنیٰ سے ادنیٰ زرعی اصلاحات کا راستہ بھی ہمیشہ کے لئے مسدود ہو جائے گا۔

تو اگرچہ اس سوال کا جواب دینے اور اس مشکل کو حل کرنے کی اصل ذمہ داری سب سے بڑھ کر اور سب سے پہلے ان نیم مذہبی اور نیم سیاسی جماعتوں پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے اپنے انتخابی منشوروں میں زمین کی ملکیت کو محدود کر دینا شامل کیا ہے۔ لیکن افسوس کہ ان جماعتوں کی جانب سے تاحال اس سوال کا کوئی جواب اور اس مشکل کا کوئی حل پیش نہیں کیا گیا' جس سے گمان ہوتا ہے کہ وہ اس معاملے میں ہرگز سنجیدہ نہیں ہیں' اور ان کے پیش نظر بھی سوائے سیاسی نعرہ بازی کے اور کچھ نہیں ہے! واللہ اعلم!!

بنابریں راقم الحروف اس بحث کا آغاز اس لئے کر رہا ہے کہ اس پر سنجیدہ غور وفکر

اور گفت وشنید کا آغاز ہو' اور خصوصاً وہ اہلِ علم اور رجالِ دین اس پر پوری توجہ مرکوز کریں جو اس ملک میں نہ صرف واقعی طور پر اسلام کی سربلندی اور دینِ حق کے غلبہ و قیام کے آرزومند ہوں' بلکہ اس کے لئے اپنی ذہن وفکر اور سعی وعمل کی جملہ صلاحیتوں کو بروئے کار لانے پر بھی آمادہ ہوں! بالخصوص ایسے اصحابِ علم و دانش آگے بڑھیں جو کتاب وسنت کے نصوص کی پابندی کے عزمِ مصمم کے ساتھ ساتھ صرف سلف کی اجتہادی آراء کے مقلد جامد بن کر نہ رہ جائیں بلکہ شریعت کے اصل مقاصد واہداف کو بھی پیش نظر رکھ سکیں اور جہد و جہاد کے جذبے سے سرشار ہونے کے ساتھ ساتھ قیاس واجتہاد اور اس کے ضمن میں مصالح مرسلہ اور مفادِ عامہ کو بھی ملحوظ رکھ سکیں۔ اس لئے کہ حکمت قرآنی کا جو اصل الاصول سورۃ الرعد کی آیت ۱۷ میں بیان ہوا ہے' اس کے مطابق دوام اور بقاء صرف ان ہی چیزوں کو حاصل ہوتا ہے ''جو لوگوں کے لئے مفید ہوں!'' اور اس کے بغیر تمام وعظ ونصیحت اور ساری سیاسی نعرہ بازی زبان کا پھاگ اور مُنہ کا جھاگ بن کر رہ جاتی ہے جس کا مقدر ہی ''سوکھ کر ختم ہو جانا'' ہے![1]

اس تمہید کے بعد اصل موضوع کی طرف رجوع کرتے ہوئے اوّلین حقیقت جو پیش نظر رہنی ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ــــــ اگرچہ قانونی اور فقہی سطح پر اسلام میں انسانی ملکیت کا تصور یقیناً موجود ہے' چنانچہ اسی پر وراثت' زکوٰۃ اور دوسرے صدقاتِ واجبہ و نافلہ وغیرہ کے جملہ فقہی احکام مترتب ہوتے ہیں' تاہم واقعہ یہ ہے کہ اسلام کی اساسی اور ایمانی تعلیمات کے مطابق یہ حق ملکیت اتنا مطلق' اتنا مقدس اور عرفِ عام میں اتنا ''گاڑھا'' نہیں ہے جتنا کہ سرمایہ دارانہ معیشت کے علمبردار خیال کرتے ہیں۔ بلکہ اس کی اصل حیثیت صرف ''حق ومنع تصرف'' کی ہے' یعنی کسی شے کے استعمال کا حق کسی ایک شخص معین کو حاصل ہو اور باقی سب کے لئے ممنوع ہو جائے!

چنانچہ قرآن حکیم کی اساسی تعلیمات کے مطابق کوئی انسان کسی دوسری شے تو کیا خود اپنے جسم وجان کا بھی مالک نہیں ہے' بلکہ اس کے وجود سمیت کائنات کی ہر شے کا

(۱) ﴿فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً ۖ وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ ۚ﴾ (الرعد:۱۷)

مالک حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ اور جسم و جان' زمین و مکان' مال و منال اور آل و اولاد سمیت ہر شے جو کسی بھی انسان کو حاصل ہوتی ہے' اس کی ملکیت کی نہیں بلکہ اس کے پاس اللہ کی ایک مقدس امانت کی حیثیت رکھتی ہے۔ بقول شیخ سعدی ؎

ایں امانت چند روزہ نزد ماست
درحقیقت مالک ہر شے خدا ست

لہٰذا ان اشیاء کے استعمال کا حق اور ان میں تصرف کا اختیار تو انسان کو حاصل ہے لیکن صرف ان قوانین و قواعد کے مطابق اور ان حدود و قیود کے اندر اندر جو مالک حقیقی یعنی اللہ تعالیٰ نے معین فرما دیئے ہیں۔

جب کہ اس کے برعکس ''سرمایہ دارانہ'' ذہنیت کی مکمل عکاسی قرآن حکیم میں حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کے لوگوں کے اس قول کی صورت میں کر دی گئی ہے:
﴿اَنْ نَّفْعَلَ فِیْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا﴾ ''کہ ہم تصرف کریں اپنے اموال میں جیسے بھی ہم چاہیں!'' (ہود: ۸۷) بہرحال اسلام اس نوع کے مطلق اور مقدس حق ملکیت کا ہرگز قائل نہیں' اس کے نزدیک انسانوں کو جو حق ملکیت حاصل ہے وہ مقید اور محدود ہے۔

پھر خاص طور پر زمین کے ضمن میں یہ معاملہ ایک قدم مزید آگے بڑھ جاتا ہے۔ اور ـــــ اگرچہ ﴿اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ﴾ یعنی ''یقیناً زمین اللہ ہی کی ملکیت ہے!'' (الاعراف: ۱۲۸) اور ﴿وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ﴾ یعنی ''زمین کو اس نے بچھا دیا تمام مخلوقات کے لئے!'' (الرحمٰن: ۱۰) اور ﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا﴾ یعنی ''وہی ہے جس نے بنایا تمہارے لئے سب کچھ جو زمین میں ہے!'' (البقرۃ: ۲۹) اور اس مضمون کی دوسری بے شمار آیات سے زمین کی ذاتی ملکیت کے خلاف کوئی قانونی اور فقہی دلیل تو نہیں اخذ کی جا سکتی' تاہم ایک رہنما اصول ضرور حاصل ہوتا ہے جس کی نہایت خوبصورت تعبیر کی ہے علامہ اقبال مرحوم نے۔ یعنی ؎

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں' اللہ کی ہے یہ زمین!

اور ؎

وہ خدایا یہ زمیں تیری نہیں' تیری نہیں!
تیرے آباء کی نہیں' تیری نہیں' میری نہیں!

اور ؎

رزقِ خود را از زمیں بردن رواست!
ایں متاعِ بندہ و ملکِ خداست!

یہی وجہ ہے کہ زمین کے بارے میں یہ شرعی ضابطہ سب کے نزدیک مسلّم ہے کہ اگر کسی قطعۂ زمین کا "مالک" اسے بے کار پڑا رہنے دے اور اس میں کاشت نہ کرے تو ایک معین عرصے کے بعد اس کا "حق ملکیت" خود بخود ختم ہو جائے گا اور زمین ضبط کر لی جائے گی۔

اور اس سے بھی آگے بڑھ کر نہایت حسین ولطیف نکتہ وہ ہے جو امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے بیان فرمایا ہے کہ چونکہ آنحضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ "میرے لئے پوری زمین کو مسجد بنا دیا گیا ہے!"[۲] لہٰذا پوری زمین کو "وقف" کی حیثیت حاصل ہے' اس لئے کہ مسجد وقف ہوتی ہے۔ (چنانچہ جملہ اوقاف کے مانند مسجد کے بھی صرف "متولی" ہوتے ہیں' مالک کوئی نہیں ہوتا!)

تاہم ان تمام نکات سے صرف اصولی رہنمائی اخذ کی جا سکتی ہے' قطعی اور قانونی جزئیات کا استنباط نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ کم از کم ہم اہل پاکستان کی حد تک اس مشکل مسئلے کا مکمل حل امیر المؤمنین اور "خلیفۃ خلیفۃ الرسول ﷺ" حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس اجتہاد میں موجود ہے جو آپؓ نے عراق' شام' ایران اور مصر کے مفتوحہ ممالک کی اراضی کے بارے میں کیا تھا اور جس پر ابتدائی ردّ وقدح اور بحث ونزاع کے بعد

---

۲) قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((جُعِلَتْ لِيَ الْاَرْضُ مَسْجِدًا وَ طَهُوْرًا......)) رواه ابوداوٗد والترمذی والنسائی والدارمی' عن علی بن ابی طالب وجابر بن عبد اللّٰه وعبد اللّٰه بن عمرو وعبد اللّٰه بن عباس وابی ھریرۃ وحذیفۃ بن الیمان وانس بن مالک وابی امامۃ وابی ذر الغفاری (رضی اللّٰه عنھم)

''اجماع'' ہو گیا تھا اور جس کی بنیاد پر شریعت اسلامی میں اراضی کی دو مستقل قسمیں قرار پا گئیں' یعنی (۱) عُشری جو انفرادی ملکیت میں ہوتی ہے اور جس کی پیداوار سے صرف عُشر یعنی دسواں حصّہ یا نصف عُشر یعنی بیسواں حصّہ بیت المال میں داخل ہوتا ہے۔ اور (۲) خراجی جو مسلمانوں کی اجتماعی ملکیت یا بالفاظ دیگر بیت المال کی ملکیت ہوتی ہے اور جس کی پیداوار میں سے کم وبیش نصف کی حد تک ''خراج'' کی صورت میں بیت المال میں داخل ہوتا ہے۔

یہ واقعہ قاضی ابو یوسفؒ نے اپنی مشہورِ زمانہ تالیف ''کتاب الخراج'' میں' جو انہوں نے عباسی خلیفہ ہارون الرشید کی فرمائش پر تالیف فرمائی تھی' نہایت عمدہ اور مفید تفاصیل کے ساتھ بیان فرمادیا ہے۔ ان مفتوحہ علاقوں کے بارے میں ایک رائے یہ تھی کہ ان کی تمام زمینیں جملہ باشندوں سمیت ''مالِ غنیمت'' کی حیثیت رکھتی ہیں جنہیں اس قانونِ غنیمت کے مطابق جو سورۃ الانفال میں بیان ہوا ہے (آیت ۴۱)' مجاہدین میں تقسیم کر دیا جانا چاہیے۔ اگر ایسا ہوتا تو ان کا صرف پانچواں حصّہ بیت المال کی ملکیت قرار پاتا اور باقی چار حصّے مجاہدین میں تقسیم ہو جاتے اور اس طرح تمام اراضی انفرادی جاگیریں بن جاتیں اور اس کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ تاریخ انسانی کا عظیم ترین جاگیردارانہ نظام قائم ہو جاتا' بلکہ ان ممالک کے تمام باشندے مسلمانوں کے شخصی ''غلام'' بن جاتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس ذوقِ سلیم اور فہم عمیق نے اس صورت کو قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا' جس کی بناء پر نبی اکرم ﷺ نے فرمایا تھا کہ: ''حق عمرؓ کی زبان پر بولتا ہے!''[۳] اور ''اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمرؓ ہوتے!''[۴] چنانچہ ان کے انقلابی واجتہادی مزاج اور عمیق اور مجتہدانہ فہم قرآن نے

---

۳) عن ابی ذر الغفاری رضی اللّٰہ عنہ قال : سمعتُ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یَقُوْلُ : ((اِنَّ اللّٰہَ وَضَعَ الْحَقَّ عَلٰی لِسَانِ عُمَرَ ' یَقُوْلُ بِہٖ)) رواہ ابو داوٗد فی الخراج والامارۃ

٤) عن عقبۃ بن عامر رضی اللّٰہ عنہ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم : ((لَوْ کَانَ بَعْدِیْ نَبِیٌّ لَکَانَ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ)) رواہ الترمذی ' باب مناقب عمر بن الخطاب

فیصلہ کیا کہ اموالِ غنیمت کا اطلاق صرف ان اموالِ منقولہ پر کیا جائے جو عین موقع جنگ پر حاصل ہوں' جیسے ہتھیار' سامانِ رسد' اور گھوڑے اور اونٹ اور دوسرے مال مویشی وغیرہ' جبکہ اراضی اور دیگر اموالِ غیر منقولہ کو مالِ ''فَے'' قرار دیا جائے جس کا حکم سورۃ الحشر کی آیات ۶ تا ۱۰ میں بیان ہوا ہے' یعنی یہ سب مسلمانوں کی اجتماعی ملکیت قرار پائیں اور ان کی آمدنی عوام کی فلاح و بہبود پر بھی خرچ ہو اور دفاعِ ملی اور دیگر امورِ مملکت میں بھی صرف ہو۔ بہر صورت کسی کی بھی انفرادی ملکیت تصور نہ ہو۔

اس پر شدید ردّ و قدح اور بحث و نزاع کا بازار گرم ہو گیا۔ حضرت عمرؓ کی اس رائے سے اختلاف کرنے والوں میں ابتداءً حضرت بلالؓ اور ان کے بعض ساتھی تھے' لیکن پھر انہیں بعض کبار صحابہ (رضی اللہ عنہم) یہاں تک کہ عشرۂ مبشرہ میں سے بھی دو حضرات یعنی حضرت زبیر بن العوامؓ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف (رضی اللہ عنہما) کی پُر زور حمایت اور وکالت حاصل ہو گئی۔ جبکہ دوسری جانب بھی کبار صحابہؓ ہی کی ایک بڑی جماعت جس میں عشرہ مبشرہ سے بھی تین حضرات یعنی حضرت عثمان' حضرت علی اور حضرت طلحہ (رضی اللہ عنہم) اور ان کے علاوہ حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) جیسے عالمانِ کتاب و سنت بھی شامل تھے' حضرت عمرؓ کی رائے سے اتفاق رکھتی تھی۔ اور اس نزاع کا فیصلہ بالآخر اس طرح ہوا کہ انصارِ مدینہ میں سے اوس اور خزرج دونوں قبیلوں سے تعلق رکھنے والے پانچ پانچ اکابر صحابہؓ کی ایک مجلس تشکیل دی گئی جو زراعت کے معاملات میں واقفیت اور مہارتِ تامہ کے حامل تھے (گویا اصطلاحِ جدید میں زراعت اور بندوبست اراضی کے ماہرین کا ایک کمیشن مقرر کیا گیا) جنہوں نے ''بالاتفاق'' حضرت عمرؓ کی رائے کی تصویب کی۔ اور اس طرح گویا اس امر پر ''اجماع'' ہو گیا کہ جو ملک یا علاقے بزورِ شمشیر فتح ہوئے ہوں ان کی اراضی کسی کی ''انفرادی ملکیت'' نہیں ہوں گی' بلکہ بیت المال کی ملکیت یا بالفاظِ دیگر مسلمانوں کی اجتماعی ملکیت قرار پائیں گی' جبکہ عُشری یعنی انفرادی ملکیت میں داخل اراضی صرف ان علاقوں کی ہوں گی جہاں کے لوگ از خود لڑے بھڑے بغیر ایمان لے آئے ہوں' جیسے

اہل یثرب جو از خود یا محض دعوت و تبلیغ سے ایمان لائے تھے' اور پھر خود جا کر نبی اکرم ﷺ کو اپنے یہاں لائے تھے۔ رضی اللہ عنہم وارضاہم اجمعین۔

اس ضمن میں ''کتاب الخراج'' کا حسب ذیل اقتباس بہت مفید ہے جس میں حضرت عمرؓ اور اوس و خزرج کے مذکورہ بالا دس اکابر و اشراف کی گفتگو نقل کی گئی ہے۔ وھو ھذا!:

''جب یہ لوگ جمع ہو گئے تو آپؓ نے اللہ کی ایسی حمد و ثنا کی جس کا وہ مستحق ہے' اور پھر فرمایا:

''میں نے آپ حضرات کو صرف اس لئے تکلیف دی ہے کہ میرے کاندھوں پر آپ کے معاملات کی ذمہ داری ہے' اس میں آپ میرا ہاتھ بٹائیں۔ کیونکہ میں بھی آپ کی طرح ایک انسان ہوں۔ آج آپ حضرات کو حق متعین کرنا ہو گا۔ بعض لوگوں نے مجھ سے اختلاف کیا ہے اور بعض نے اتفاق۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ حضرات بہر حال وہی رائے قبول کریں جو میں نے اختیار کی ہے۔ آپ کے پاس اللہ کی کتاب ہے جو حق بات کہتی ہے۔ خدا کی قسم! اگر میں نے کوئی بات کہی ہے جس پر میں عمل کا ارادہ رکھتا ہوں تو اس سے میرا ارادہ سوائے اتباع حق کے کچھ اور نہیں۔''

ان لوگوں نے کہا:

''امیر المؤمنین! آپ فرمایئے' ہم سنیں گے (اور غور کریں گے)''

تو آپؓ نے فرمایا:

''آپ حضرات نے ان لوگوں کی باتیں سن لی ہیں جن کا خیال ہے کہ میں ان کی حق تلفی کر رہا ہوں۔ میں ظلم کے ارتکاب سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں' اگر میں نے کوئی ایسی چیز جو اُن لوگوں کا حق تھی' ان کو نہ دی ہو اور دوسروں کو دی ہو' تو میں بڑا ہی بد بخت ہوں' لیکن میرا خیال ہے کہ کسریٰ کی سرزمین کے بعد اب کوئی چیز نہیں رہ گئی ہے جو فتح ہو۔ اللہ نے ان کے اموال' زمینیں اور کاشتکار ہمیں بطور غنیمت عطا کر دیئے ہیں۔ ان لوگوں کو غنیمت سے جو مال ملا تھا اسے تو میں نے اس کے مستحقین میں تقسیم کر دیا ہے' اور پانچواں حصہ نکال کر اسے اس کے متعینہ

مصارف میں تقسیم کر دیا ہے' بلکہ ابھی اس کی تقسیم میں مصروف ہوں۔ میں نے یہ رائے قائم کی ہے کہ زمینوں کو مع کاشتکاروں کے سرکاری ملکیت قرار دے دوں اور اس کے کاشتکاروں پر خراج عائد کر دوں اور ان پر فی کس جزیہ مقرر کر دوں جسے وہ ادا کرتے رہیں۔ اس طرح یہ جزیہ اور خراج مسلمانوں کے لئے (ایک مستقل) ''فئے'' کا کام کرے گا جس کی آمدنی میں فوجی' کم سن افراد اور آنے والی نسلیں حصہ دار ہوں گی۔ دیکھئے! ان سرحدوں کی حفاظت کے لئے بہرحال کچھ آدمی تعینات کرنے ہوں گے جو مستقلاً وہاں رہیں۔ یہ بڑے بڑے علاقے' جیسے شام' الجزیرہ' کوفہ' بصرہ' مصر' ان میں فوجی چھاؤنیاں قائم رکھنا اور ان کو وظائف دیتے رہنا ناگزیر ہے۔ اب اگر یہ زمینیں اور ان پر محنت کرنے والے کاشتکار تقسیم کر دیئے جائیں گے تو ان لوگوں کو کہاں سے دیا جائے گا؟''

یہ سن کر سب نے کہا:

''آپ ہی کی رائے صحیح ہے۔ آپ نے جو فرمایا وہ خوب ہے' اور جو رائے قائم کی وہ بہت موزوں ہے۔ اگر ان شہروں اور سرحدوں میں افواج نہیں رکھی جائیں گی اور ان کے لئے بطورِ تنخواہ کچھ مقرر نہ کیا جائے گا تو اہل کفر اپنے شہروں پر پھر سے قابض ہو جائیں گے۔''

آخر میں آپؓ نے فرمایا: ''اب مجھ پر معاملہ واضح ہو گیا۔ اب یہ بتاؤ کہ کون ایسا ماہر اور دانش مند ہے جو اِن زمینوں کا مناسب طور پر بندوبست کر دے اور کاشت کاروں پر اُن کی برداشت کے مطابق خراج تجویز کر دے؟'' لوگوں نے بالاتفاق عثمان بن حُنیف کا نام پیش کیا اور کہا: ''آپ ان کو اس کام کا ذمہ دار بنا کر بھیج سکتے ہیں' کیونکہ یہ صاحب فہم و بصیرت اور تجربہ کار انسان ہیں۔'' چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بلا تاخیر اُن کو علاقہ سواد کی پیمائش کے کام پر مقرر کر دیا۔''

(''کتاب الخراج'' ترجمہ: ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی)

خلافت' ملوکیت اور جاگیرداری

گزشتہ مباحث کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

(۱) اگرچہ انفرادی سطح پر جو بلند ترین نصب العین اسلام انسان کو عطا کرتا ہے وہ رضائے الٰہی اور فلاحِ اُخروی کا حصول ہے' لیکن دنیا کی زندگی میں اجتماعی سطح پر اسلام کا بلند ترین مقصد یا ہدف' یا بالفاظِ دیگر نصب العین سماجی انصاف اور نظامِ عدلِ اجتماعی کا قیام ہے!

(۲) سماجی انصاف کے ضمن میں اگرچہ اصولی طور پر معاشرتی سطح پر اوّلین اہمیت کامل انسانی مساوات اور باہمی اخوت کو حاصل ہے' اور سیاسی سطح پر یہی حیثیت حریت اور قانونی و دستوری برابری کو حاصل ہے' لیکن موجودہ دنیا میں سماجی انصاف کا اوّلین تقاضا جس پر باقی تمام امور کا کلی دارومدار ہے' معاشی عدل اور کم از کم ''مواقع'' کے اعتبار سے کامل مساوات ہے!

(۳) اگرچہ عہد حاضر میں عالمی سطح پر تو معاشی ظلم اور استحصال کا سب سے بڑا ذریعہ سرمایہ دارانہ معیشت کا وہ عالمگیر نظام ہے جس کی اساس ''سرمایہ کے سود'' پر قائم ہے' لیکن پاکستان چونکہ بنیادی طور پر زرعی معیشت کا حامل ملک ہے' لہٰذا یہاں معاشی جبر و استبداد اور ظلم و استحصال کا سب سے بڑا مظہر ''زمین کے سود'' پر مبنی جاگیرداری اور غیر حاضر زمینداری کا نظام ہے جس کی بیخ کنی کے بغیر یہاں سماجی انصاف کا کوئی تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔

(۴) دَورِ خلافت راشدہ کا سیاسی نظام چونکہ اللہ کی حاکمیت کے تحت اس کے فرماں بردار بندوں کی ''اجتماعی خلافت'' کا نظام تھا جس کی اصل اساس عدل و قسط پر قائم تھی' لہٰذا اگرچہ اس کے دوران وہ نازک مرحلہ بھی آیا جس پر ذرا سی غفلت یا ڈھیل

سے تاریخ انسانی کے عظیم ترین جاگیردارانہ نظام کی بنیاد قائم ہو جاتی لیکن ع ''اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار!'' کے مصداق حضرت عمر فاروقؓ کی اجتہادی بصیرت نے تمام مفتوحہ ممالک کی کل اراضی کو خراجی یعنی تمام مسلمانوں کی ''اجتماعی ملکیت'' قرار دے کر اس کا کامل سدِ باب کر دیا۔

لیکن افسوس کہ جیسے ہی خلافت راشدہ کا دَور ختم ہوا اور خلافت نے تدریجاً ملوکیت کی صورت اختیار کرنی شروع کی' اس معاملے میں بھی زوال کا آغاز ہو گیا اور جو دروازہ حضرت عمرؓ نے اپنی اجتہادی بصیرت اور بے مثال ہمت و جرأت سے بند کیا تھا' آہستہ آہستہ کھلنا شروع ہو گیا۔ اس کے نتیجے میں جاگیرداری اور غیر حاضری زمینداری نے عالم اسلام میں قدم جمانے شروع کر دیئے۔

یہاں یہ عرض کرنے کی چنداں حاجت نہیں ہے کہ جاگیرداری اور ملوکیت کا چولی دامن کا ساتھ ہے' اور یہ کہنا ہرگز غلط نہ ہوگا کہ جیسے بعض حشرات الارض (مثلاً کنکھجورا) کے سینکڑوں پاؤں ہوتے ہیں ایسے ہی جاگیردار اور ''لینڈ لارڈز'' ملوکیت' شہنشاہیت اور ''امپیریلزم'' کے پاؤں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بلکہ غالباً اس سے بھی صحیح تر مثال برگد کے درخت کی اضافی جڑوں کی ہے کہ جیسے جیسے اس کا پھیلاؤ بڑھتا جاتا ہے اس کی شاخوں سے انسانی داڑھی کے سے انداز میں اضافی جڑیں نیچے اترنی شروع ہو جاتی ہیں جو زمین تک پہنچ کر اور اس میں قدم جما کر نہ صرف اضافی جڑوں کا کام دیتی ہیں جن سے زمین کی غذائیت درخت کو حاصل ہوتی ہے بلکہ ستونوں کی صورت اختیار کر کے اضافی سہارا بھی بن جاتی ہیں۔ بعینہٖ یہی معاملہ ملوکیت اور شہنشاہیت کا ہے کہ یہ جیسے جیسے پھلنی اور پھیلنی شروع ہوتی ہے اپنے وفاداروں اور خدمت گزاروں کو جاگیرداری کی مسندیں اور منصب عطا کر کے انہیں کاشتکاروں کے استحصال کے ذریعے اپنے اقتدار کے سہاروں کی حیثیت دے دیتی ہے۔

چنانچہ یہی حادثہ خلافت راشدہ کے خاتمے کے بعد عالم اسلام کو پیش آیا۔ حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ سے نبی اکرم ﷺ کا ایک قول مبارک امام احمدؒ' امام ترمذیؒ اور

امام ابوداوٗدؒ نے روایت کیا ہے کہ: ”خلافت تیس برس تک رہے گی‘ اس کے بعد ملوکیت کا آغاز ہو جائے گا۔“(۵) اور امام احمدؒ نے آنحضور ﷺ کی ایک اور حدیث جو حضرت نعمان بن بشیرؓ سے روایت کی ہے‘ اس میں آپ ﷺ نے اس ملوکیت کے ساتھ ”کاٹ کھانے والی“ یعنی ظالم اور غاصب کی صفت کا اضافہ فرمایا ہے(۶)۔ تو اگرچہ تاریخ اسلام میں خلافت کے پورے طور پر ملوکیت میں تبدیل ہونے میں تو لگ بھگ ایک صدی کا عرصہ لگا‘ اس لئے کہ ملوکیت کے اصل ٹھاٹھ باٹھ پورے طور پر بنو عباسؓ کے دَور میں شروع ہوئے تاہم اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس کے آثار امیر معاویہؓ کے عہد حکومت ہی میں شروع ہو گئے تھے۔ جس کے نتیجے میں اسلام کی تعلیمات کے ایک حصے پر پردے پڑنے کے اس عمل کا آغاز ہو گیا تھا جس کا تذکرہ ۱۹۳۰ء میں علامہ اقبال نے اپنے خطبہ الٰہ آباد میں ان الفاظ میں کیا تھا کہ:

> ”میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ تقدیر مبرم ہے کہ ہندوستان کے شمال مغربی حصے میں ایک آزاد مسلمان ریاست قائم ہو گی۔ اور اگر ایسا ہو گیا تو ہمیں ایک موقع مل جائے گا کہ اسلام کے چہرے پر جو پردے عرب امپیریلزم کے دَور میں پڑ گئے تھے انہیں ہٹا کر اسلام کی اصل تعلیمات کی ایک عملی صورت دنیا کو دکھا سکیں!“

واضح رہے کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ ایک جلیل القدر صحابی ہیں۔ اور خواہ اسے ؎

”مگس کو باغ میں جانے نہ دیجو
کہ ناحق خون پروانے کا ہو گا!“

کے مصداق ہی قرار دیا جائے‘ بہر حال میری سوچی سمجھی اور پختہ رائے یہ ہے کہ ان کی

---

۵) عن سعید بن جمهان قال حدثنی سفینة (رضی الله عنه) قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم : ((الْخِلَافَةُ فِیْ اُمَّتِیْ ثَلَاثُوْنَ سَنَةً ثُمَّ مُلْكٌ بَعْدَ ذٰلِكَ)) ثم قال لی سفینة : اَمْسِكْ خلافة ابی بکر ' ثم قال : وخلافة عمر و خلافة عثمان' ثم قال : امسك خلافة علی ' فوجدناها ثلاثین سنة ......رواه الترمذی فی الفتن ' باب ماجاء فی الخلافة ورواه ابو داوٗد فی السنة ' باب فی الخلفاء۔

٦) حدیث کے الفاظ ہیں : ((......ثُمَّ تَکُوْنُ مُلْکًا عَاضًّا......))

نیت پر شک کرنا حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت پر اپنے ایمان کو مشکوک بنانے کے مترادف ہے' اس لئے کہ اگرچہ وہ فتح مکہ کے دن ایمان لائے تھے تاہم اس کے بعد پورے اڑھائی سال تک نہ صرف یہ کہ آنحضور ﷺ کی صحبت سے فیض یاب ہوئے بلکہ ''کاتب وحی'' کی اہم اور نازک ذمہ داری تک کے اہل قرار پائے۔ بنابریں یہ گمان کہ ان کا تزکیۂ نفس اور تصحیح نیت نہیں ہو پائی تھی مزکیٔ اعظم ﷺ پر طعن کی حیثیت رکھتا ہے —— تاہم دوسری جانب اس حقیقت سے صرفِ نظر بھی نہ حقائق و واقعات کے اعتبار سے ممکن ہے' نہ نصوصِ حدیث نبوی ﷺ کی رو سے درست ہے' کہ ان کا دورِ حکومت دَورِ خلافتِ راشدہ میں شامل نہیں ہے۔ اور خواہ یہ خالص ''حالات کے جبر'' اور مصالح اُمت ہی کے تقاضوں کے تحت ہوا ہو' بہرحال واقعہ یہی ہے کہ اسلام کی تعلیمات کے ایک حصّے کے پردے کے پیچھے چھپ جانے یا بالفاظِ دیگر اس سورج کو گہن لگ جانے کا عمل ان ہی کے دَورِ حکومت سے شروع ہو گیا تھا۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا یہ قول ہے جسے امام بخاریؒ نے ''کتاب العلم'' میں روایت کیا ہے کہ:

> ''حَفِظْتُ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وِعَائَيْنِ ' فَاَمَّا اَحَدُهُمَا فَبَثَثْتُهُ فِيْكُمْ ' وَاَمَّا الْآخَرُ فَلَوْ بَثَثْتُهُ قُطِعَ هٰذَا الْبُلْعُوْمُ''
>
> ''میں نے اللہ کے رسول ﷺ سے (علم کے) دو برتن حاصل کئے۔ تو ان میں سے ایک کو تو میں نے تمہارے مابین خوب عام کر دیا ہے' لیکن اگر دوسرے کو عام کر دوں تو میری گردن کاٹ دی جائے گی!''

(واضح رہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کی وفات ۵۷ھ یا ۵۸ھ یا زیادہ سے زیادہ ۵۹ھ میں گویا حضرت معاویہؓ کی وفات سے ایک سال قبل ہو گئی تھی۔) تو اگرچہ اس قول میں یہ صراحت نہیں ہے کہ وہ دو برتن کون سے ہیں' تاہم یہ بات بادنیٰ تامل سمجھ میں آ سکتی ہے کہ جس علم کے عام کئے جانے سے کسی کو کوئی گزند نہیں پہنچ سکتا تھا لہٰذا اس کے عام کرنے والے کو بھی کوئی اندیشہ لاحق نہیں ہو سکتا تھا' وہ تھا نماز' روزہ' زکوٰۃ اور حج' یعنی

عبادات کے مسائل یا نکاح وطلاق وغیرہ کے مسائل کا علم۔ اور جس علم سے مراعات یافتہ طبقات کے مفادات پر آنچ آ سکتی تھی' چنانچہ اس کے عام کرنے والے کی ذات کو بھی خطرہ لاحق ہو سکتا تھا' وہ تھا نظامِ حکومت اور عمالِ حکومت' اور زمینداری اور جاگیرداری سے متعلق اصولی اور تفصیلی ہدایات کا علم!

قصہ مختصر' جیسے ہی عالم اسلام میں ملوکیت نے جڑیں جمانی شروع کیں جاگیرداری کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ اور حضرت معاویہؓ کے انتقال کے بعد چالیس سال کے دوران اس خباثت نے اپنی جڑیں جتنی کچھ پھیلا لی ہوں گی اس کا اندازہ ہرگز مشکل نہیں ہے۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ کی اس حدیث مبارک کے مطابق کہ:

((اِنَّ اللّٰـهَ يَبْعَثُ لِهٰذِهِ الْاُمَّةِ عَلٰى رَأْسِ كُلِّ مِائَةِ سَنَةٍ مَنْ يُجَدِّدُ لَهَا دِيْنَهَا))(۷)

''یقیناً اللہ تعالیٰ اس اُمت میں ہر صدی کے سرے پر ایسے اولوالعزم لوگوں کو کھڑا کرتا رہے گا جو اس کے لئے اس کے دین کو از سر نو تازہ کر دیں گے!''

پہلی صدی ہجری کے اختتام اور دوسری صدی کے آغاز پر جو مجدّدِ اوّل (اور تا حال اعظم بھی' اس لئے کہ وہ واحد مجدّد تھے جو صاحب اختیار و اقتدار بھی تھے اور جن کے ذریعے صرف علمی و فکری تجدید اور عقائد و اخلاق کی اصلاح نہیں بلکہ نظامِ حکومت کی اصلاح ہوئی!) یعنی حضرت عمرؓ کی پوتی کے صاحبزادے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ (۹۹ھ تا ۱۰۱ھ) ''مبعوث'' ہوئے' تو انہوں نے جہاں ایک جانب اپنی ''نامزدگی'' سے اظہارِ براءت کیا اور منصب حکومت صرف اس وقت اختیار کیا جب لوگوں نے کہا کہ ہم اپنی آزادانہ مرضی سے آپ کی خلافت قبول کرتے ہیں' وہاں دوسری جانب جو اہم ترین تجدیدی کارنامہ سرانجام دیا وہ یہی تھا کہ جاگیروں کے وثیقے اور دستاویزات منگوا کر چاک کر دیں اور اس طرح کم از کم ایک بار تو پھر نظامِ اسلام کو ''زمین کے سود''

---

۷) عن ابی ہریرۃ رضی اللّٰہ عنہ۔ اخرجہ ابو داوٗد فی الملاحم' باب ما یذکر فی قرن المائۃ' واسنادہ صحیح' ورواہ ایضاً الحاکم وصححہ ووافقہ الذہبی

سے پاک کر دیا۔

محترم صاحبزادہ عبدالرسول صاحب نے اپنی تالیف ''تاریخ اسلام'' میں اس سلسلہ میں ایک مکالمہ نقل کیا ہے کہ: ''یہ حالت دیکھ کر بنواُمیہ سے نہ رہا گیا۔ انہوں نے ہشام (بن عبدالملک جو خود بھی چند سال بعد حکمران بنا) کو اپنا نمائندہ بنا کر آپؒ کے پاس بھیجا۔ اس نے آپؒ سے کہا کہ آپ اپنے عہد میں جو چاہیں کریں لیکن جو کام پچھلے خلفاء کر گئے ہیں انہیں اپنی حالت میں رہنے دیں۔ آپؒ نے جواب دیا کہ اگر ایک ہی معاملے میں تمہارے سامنے دو دستاویزات ہوں' ایک امیر معاویہؓ کی اور دوسری عبدالملک کی' تو تم کس پر عمل کرو گے؟ اس نے کہا قدیم دستاویز پر! اس پر آپؒ نے فرمایا کہ ''میرے پاس قدیم دستاویز کتاب اللہ ہے' میں اس پر عمل پیرا ہوں!''...اور ظاہر ہے کہ یہ بات وہی شخص کہہ سکتا تھا جس کی رگوں میں' خواہ صرف والدہ ماجدہ ہی کی جانب سے سہی' کسی نہ کسی درجے میں عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا خون بھی دوڑ رہا تھا!

تاہم حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا عہد خلافت ع ''خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود!'' کی مثال تھا۔ ان کو زہر دے کر شہید کرنے کے بعد' بنواُمیہ کے بقیہ تیس سالہ دَورِ حکومت اور اس کے بعد دولت بنی عباسؓ کے دوران ''عرب امپیریلزم'' کے سائے میں جاگیرداری اور غیر حاضر زمینداری کا شجر خبیثہ خوب پھلا پھولا۔ اور اگرچہ فقہ اسلامی کے دونوں سلسلوں یعنی اصحابِ حدیث اور اصحابِ رائے و قیاس کے ''امامین اوّلین'' یعنی امام اعظم ابوحنیفہؒ اور امام دارالہجرت مالک بن انسؒ نے ''مزارعت'' کو حرام مطلق قرار دے کر اس شجرۂ خبیثہ کی جڑ پر بھرپور تیشہ چلایا اور کاری وار کیا' اور اس کے نتیجے میں قید و بند اور زدوکوب کی صعوبتیں برداشت کیں' لیکن جیسے جیسے ملوکیت اور جاگیرداری کی جڑیں زمین میں گہری اترتی گئیں حالات کے جبر اور ''نظریۂ ضرورت'' کے عمل دخل کا ظہور ہوا اور امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد رشید قاضی ابویوسفؒ نے جہاں ''قاضی القضاۃ'' کا وہ عہدہ بھی قبول فرما لیا جس کو قبول کرنے سے ان کے مربّی اور استاذؒ نے سختی کے ساتھ انکار کر کے تشدّد و تعذیب کو دعوت دی تھی' وہاں انہوں نے امام

صاحب کے دوسرے شاگرد امام محمدؒ کے اتفاقِ رائے کے ساتھ مزارعت پر کچھ شرائط عائد کر کے اس کے جائز ہونے کا فتویٰ بھی دے دیا۔ بعد میں وہ شرائط تو طاقِ نسیاں کے حوالے ہو گئیں اور پورے عالم اسلام میں ''مزارعت'' شیر مادر کی مانند حلال وطیب ہو گئی اور اس طرح شہنشاہیت اور جاگیرداری کو دوام واستحکام حاصل ہو گیا! (کچھ ایسا ہی معاملہ فقہ اسلامی کی دوسری عظیم شاخ یعنی اصحابِ حدیث کے ساتھ بھی پیش آیا۔ یعنی امام مالکؒ کے شاگرد امام شافعیؒ نے تو کھلے کھیت میں مزارعت کی حرمت کے فتوے کو برقرار رکھتے ہوئے صرف باغ کے تابع کھیت میں اس کے جواز کا فتویٰ دیا تھا' لیکن ان کے بعد امام احمدؒ اور امام بخاریؒ وغیرہم نے اسے بالعموم جائز قرار دے دیا! گویا ع ''متفق گردید رائے بوعلی با رائے من'' کے مصداق کم از کم جاگیرداری اور غیر حاضر زمینداری کے معاملے میں یہ دونوں متحارب سلسلہ ہائے فقہ متفق ہو گئے۔)

کچھ اسی قسم کا معاملہ بزورِ شمشیر فتح ہونے والے علاقوں کی اراضی کو ''بیت المال کی ملکیت'' میں برقرار رکھ کر ان سے حاصل شدہ خراج کو دفاع اور دیگر انتظامی ضروریات اور سب سے بڑھ کر عامتہ المسلمین اور عوام الناس کی فلاح و بہبود کے لئے وقف رکھنے کی بجائے منظورِ نظر اشخاص وافراد کو جاگیروں کی صورت میں دے کر ان کی ذاتی ملکیت قرار دینے کے معاملے میں ہوا۔ جس کے لئے دلیل نبی اکرم ﷺ کے اس معاملے سے لائی گئی جو آپؐ نے ۷ھ میں فتح خیبر کے بعد وہاں کے یہودیوں کے ساتھ کیا تھا۔ حالانکہ سیدھی سی بات ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو اجتہاد اپنے دَورِ خلافت میں کیا' وہ فتح خیبر کے کم وبیش دس سال بعد کا واقعہ ہے۔ اور جبکہ یہ معلوم ہے کہ ان کی رائے پر ردّ وقدح اور بحث ونزاع کا بازار پوری طرح گرم رہا تھا' جس کی تفصیل گزشتہ صفحات میں دی جا چکی ہے' تو یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ جو حضرات مفتوحہ اراضی کو مالِ غنیمت کے طور پر تقسیم کرنے کے حق میں تھے انہوں نے آنحضور ﷺ کے معاملۂ خیبر کو دلیل کے طور پر پیش نہ کیا ہو۔ اور اگرچہ ہمارے پاس اس ردّو قدح اور بحث ونزاع کا کوئی مفصل ریکارڈ محفوظ نہیں ہے' تاہم یہ بات تو اظہر من

الشمس ہے کہ اس دلیل کا ردّ یقیناً کسی زیادہ وزنی دلیل ہی سے کیا گیا ہوگا۔ ورنہ کیسے ممکن ہے کہ آنحضور ﷺ کے انتقال کے صرف چند سال بعد دورِ خلافت راشدہ ہی میں آپ ﷺ کے طرزِ عمل کے برعکس معاملے پر اتفاق ہو جاتا۔ رہی یہ بات کہ وہ دلیل کیا تھی تو قرائن سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بنیاد اسی امر واقعی پر ہوگی کہ خیبر کا معاملہ سود کی آخری اور قطعی حرمت والی آیات کے نزول سے لگ بھگ اڑھائی سال قبل کا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ حرمت ربا کے حکم نے جملہ مالی معاملات اور اقتصادی امور کے ضمن میں صورتِ حال کو یکسر تبدیل کر کے رکھ دیا تھا۔ چنانچہ متعدد احادیث اس پر گواہ ہیں کہ آپ ﷺ نے مزارعت کے معاملے کو بھی "ربا" قرار دیا۔ اور چونکہ اِن آیاتِ مبارکہ کے نزول کے بعد نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ دُنیوی بہت مختصر رہی لہٰذا حرمتِ ربا کی زد کن کن معاملات پر پڑتی ہے اس کی پوری تفصیل صحابہ کرامؓ پر واضح نہیں ہو سکی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ:

"اِنَّ آخِرَ مَا نَزَلَتْ آيَةُ الرِّبَا' وَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قُبِضَ وَ لَمْ يُفَسِّرْ هَا لَنَا' فَدَعُوا الرِّبَا وَ الرِّيْبَةَ"(۸)

"قرآن میں جو آیات بالکل آخر میں نازل ہوئیں ان میں آیت ربا بھی ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ کا انتقال ہو گیا جب کہ ابھی آپ ﷺ نے اس آیت کی پوری تفسیر ہمیں نہیں سمجھائی تھی۔ پس نہ صرف ربا کو ترک کر دو' بلکہ جس معاملے میں ربا کا شک اور شائبہ بھی پیدا ہو جائے اسے بھی ترک کر دو!"

بہر حال یہ ہے وہ تاریخی پس منظر جس میں دورِ ملوکیت میں مرتب ہونے والی فقہ کے مالی اور معاشی مسائل میں ایک جانب بیع مؤجل اور بیع مرابحہ کے جواز کے راستے سے "سرمایہ کا سود" تو دبے پاؤں بالکل غیر محسوس انداز میں داخل ہو گیا' رہا "زمین کا سود" تو وہ تو حسب ذیل فتوے کی رو سے پورے دھڑلے کے ساتھ پورے عالم اسلام میں رائج ہو گیا کہ "پس حکمران کو اختیار ہے کہ چاہے تو مفتوحہ اراضی کو مالِ غنیمت کے طور پر فاتحین میں تقسیم کر دے' جیسے کہ نبی اکرم ﷺ نے خیبر کے معاملے میں کیا تھا' یا

۸) عن سعید بن المسیب۔ رواہ ابن ماجہ فی التجارات ' باب التغلیظ فی الربا' واسنادہ صحیح

چاہے تو وہ معاملہ کرے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سوادِ عراق کے ضمن میں کیا تھا''۔ (المبسوط) اس لئے کہ اس فتوے کے ذریعے جاگیرداری جائز ہو گئی جس کا سارا دارومدار ہی مزارعت پر ہے' جو زمین کے ربا کی حیثیت رکھتی ہے۔

اوپر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا جو قول ''علم کے دو برتنوں'' کے ضمن میں نقل ہوا ہے اس کی حقیقت مزید اجاگر ہو جائے گی اگر یہ بات پیش نظر رہے کہ ایک مجلس کی تین یا تین سے بھی زائد طلاقوں کے ضمن میں نبی اکرم ﷺ جو ایک رعایت اور نرمی فرمایا کرتے تھے اسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مصلحت اُمت کے پیش نظر اپنے ایک اجتہادی فیصلہ سے ختم کر دیا تو اس پر تو اہل سنت کے چاروں مکاتب فقہ کا اس درجہ عزم بالجزم کے ساتھ اصرار ہے کہ کسی بھی صورت میں نبی اکرم ﷺ کی رعایت کو دوبارہ جاری کرنے پر آمادہ نہیں ہیں' لیکن جاگیرداری اور زمینداری کے مسئلے میں حضرت عمرؓ کے اجتہاد اور اس پر اُس وقت کے ''اجماع'' کو رد کر کے حضور ﷺ کے معاملۂ خیبر پر عمل کرنے کے اختیار کو حاکم وقت کے لئے تسلیم کرتے ہیں۔ حالانکہ اگر ''اجماع'' کوئی خالص تصوراتی بلکہ وہمی شے نہیں ہے' بلکہ اس کا کوئی واقعی وجود ممکن ہے' تو وہ یا تو صرف دورِ خلافت راشدہ کا اجماع ہی ہو سکتا تھا جب پورا عالم اسلام ایک سیاسی وحدت تھا' یا پھر قیامت کے قریب اس وقت ممکن ہو گا جب آنحضور ﷺ کی پیشین گوئی کے مطابق تمام روئے ارضی پر خلافت علیٰ منہاج النبوت یعنی اسلام کے ''جسٹ ورلڈ آرڈر'' کا نظام قائم ہو جائے گا۔

تاہم میری ان معروضات کو نہ مفتیانِ کرام کی توہین پر محمول کیا جائے' نہ فقہائے عظام کی تنقیص پر' بلکہ جیسے کہ سطورِ گزشتہ میں عرض کیا گیا تھا' مقصود صرف یہ ہے کہ ان مسائل پر بحث و گفتگو کا آغاز ہو۔ اور مصالح مرسلہ اور مفادِ عامہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے افہام و تفہیم کے ذریعے آئندہ کے لئے راہیں متعین کی جائیں۔

البتہ یہ بات ضرور یاد رکھنی چاہئے کہ اگر اُس دَور میں جبکہ ابھی ملوکیت بھی جڑیں پکڑ ہی رہی تھی' اور ''کسرائے عرب'' یا ''کسرائے اسلام'' بھی ایک جلیل القدر صحابی

(حضرت معاویہؓ) تھے‘ ایک دوسرے جلیل القدر صحابی (حضرت ابوہریرہؓ) کو اپنی اس بشری کمزوری کے اعتراف میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوئی کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے حاصل شدہ علم کے ایک برتن کا منہ جان کے خوف سے بند کر رکھا ہے‘ تو اس کے سو ڈیڑھ سو برس بعد جبکہ ملوکیت بھی اپنی پوری شان اور کروفر کے ساتھ جلوہ گر ہو چکی تھی‘ اور ”قرونٌ مشھودٌ لھا بالخیر“ (یعنی وہ ادوار جن کے خیر کے حامل ہونے کی گواہی خود آنحضور ﷺ نے دی ہے) کا زمانہ بھی بیت چکا تھا‘ علمائے اسلام اور فقہائے کرام کا حالات کے جبر سے متاثر ہو جانا ہرگز نہ بعید از قیاس ہے نہ ان کے لئے موجب توہین!

بہرحال جاگیرداری اور غیر حاضر زمینداری کے ظالمانہ اور استحصالی نظام سے نجات پانے کی واحد شرعی راہ یہ ہے کہ شمشیر فاروقیؓ کو بے نیام کیا جائے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اجتہاد کے مطابق (جس پر کم از کم اُس وقت اجماع بھی ہو گیا تھا) تمام مفتوحہ ممالک کی اراضی کو ”خراجی“ یعنی بیت المال یا مسلمانوں کی اجتماعی ملکیت قرار دیا جائے جو کسی کی انفرادی ملکیت میں ہیں ہی نہیں کہ وہ سارے مسائل پیدا ہوں جو سپریم کورٹ کے شریعت اپیلیٹ بنچ کے فاضل جج صاحبان نے اپنے فاضلانہ فیصلوں میں اٹھائے ہیں۔ بنا بریں اب تک مسلمان حکمرانوں یا غیر مسلم حاکموں نے جن جن لوگوں کو جاگیریں عطا کی تھیں ان سے جو استفادہ وہ اب تک کر چکے ہیں اس کو ﴿فَلَهٗ مَا سَلَفَ﴾ (البقرہ: ۲۷۵) کا مصداق قرار دے کر (یعنی: جو گزر چکا وہ ان کو معاف ہے!) آئندہ ایک ایسے نئے بندوبست اراضی کا اہتمام کیا جائے جس سے سماجی انصاف کے تقاضے بھی پورے ہوں‘ عوام کی عظیم اکثریت کی معاشی حالت بھی بہتر ہو‘ زمین کی پیداوار میں بھی اضافہ ہو‘ اور قوم اور ملک کو بھی استحکام حاصل ہو۔ اس ضمن میں دو باتیں مزید انشراح کا ذریعہ بن سکتی ہیں:

(۱) ایک یہ کہ بیسویں صدی عیسوی کے آغاز تک جو ممالک خلافت عثمانیہ کے زیر نگیں تھے‘ ان میں یہی بندوبست اراضی رائج تھا کہ تمام اراضی سرکاری ملکیت میں تھیں اور کاشتکاری بھی ”موروثی مزارعت“ کی بنیاد پر نہیں تھی بلکہ ایک کاشتکار کے انتقال کے بعد اس کے وارثوں کو از سر نو پروانہ کاشتکاری حاصل کرنا ہوتا تھا۔

(۲) دوسرے یہ کہ ہندوستان کے انیسویں صدی کے سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ کے نامور شیخ اور عظیم ترین مفسر، محدّث اور فقیہہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی ؒ (صاحب تفسیر مظہریؒ) نے اپنی مشہورِ زمانہ تالیف "مـا لا بُـدّ مـنـه" میں صاف تحریر فرمایا ہے کہ "چونکہ اس ملک میں زمینیں عُشری نہیں (بلکہ خراجی) ہیں، لہٰذا اس کتاب میں عُشر اور عاشر (یعنی عُشر وصول کرنے والے تحصیل داروں) کے احکام بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے!"

واضح رہے کہ یہ کتاب فقہ حنفی کے قاعدے یا پرائمر کی حیثیت سے تمام مدارس عربیہ میں پڑھائی جاتی ہے۔

آخر میں سپریم کورٹ آف پاکستان کے شریعت بینچ کے متذکرہ بالا فیصلے پر جو فاضلانہ تبصرہ ملک کے ایک ماہر قانون دان جناب سردار شیر عالم صاحب نے کیا ہے، جو پاکستان لاء جرنل کی اشاعت بابت مارچ ۱۹۹۳ء میں "قرارداد مقاصد اور عدلیہ کا کردار!" کے عنوان سے شائع ہوا ہے اس کے حسب ذیل دو افتتاحی اور اختتامی جملے ہدیۂ قارئین ہیں:

(1) "In Qazilbash Waqf case, the Land Regulation of 1972 and Land Reforms Act of 1977 which fixed the ceiling for land holding were struck down on the basis of repugnency to Islam. The court broke through the protective stonewall erected by Articales 253, 8(3), (24), 268 (2), 269 and reinforced by Article 203B (c) of the Constitution."

(2) "Now the situation is that the judicial pronouncement of the Supreme Court has struck down the land reforms as un-Islamic and thus defeated the operation of so many constitutional provisions including 253 (2). But it remains an open question even now as to which one should prevail, the effect of a constitutional provision i.e. 253(2) or the effect of judicial pronouncement."

کاش کہ سپریم کورٹ آف پاکستان اپنے اس فیصلے پر از خود نظر ثانی کرنے کا فیصلہ کرے۔ اللّٰھم آمین!

اسلام کے دو معاشی نظام

سماجی انصاف کے ضمن میں عہد حاضر میں معاشی عدل کی اہمیت اور اس سلسلے میں خاص طور پر پاکستانی معاشرے سے جاگیرداری' غیر حاضر زمینداری اور مزارعت کے خاتمے کی بحث کے ضمن میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ معاشی اور اقتصادی معاملات کے بارے میں شریعتِ اسلامی کے احکام کی پشت پر جو بنیادی اصول کارفرما ہیں انہیں اچھی طرح سمجھ لیا جائے' تاکہ ان کے پس منظر میں شریعت کے احکام کی حکمتیں سامنے آ سکیں اور ذہن وقلب میں انشراح پیدا ہو سکے۔

اسلام نے معاشی اور اقتصادی معاملات میں عدل وقسط کا جو مقام متعین کیا ہے' جس میں اس نے مساوات اور آزادی ایسی بظاہر متضاد اقدار کو نہایت خوبصورتی اور توازن سے سمو دیا ہے اس کے بارے میں یہ بات شاید اکثر لوگوں کو چونکا دے (اور یہی میں چاہتا ہوں تاکہ ذہن بیدار ہو جائیں) وہ یہ ہے کہ اسلام کا معاشی نظام ایک نہیں دو ہیں' اور دونوں اپنی اپنی جگہ از ابتدا تا انتہا مکمل ہیں۔ چنانچہ دونوں کا اپنا اپنا فلسفہ ہے' دونوں کا مختلف نظریۂ ملکیت' نظریۂ حقوق اور نظریۂ قدرِ زائد (Surplus value) ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہی چیزیں کسی معاشی نظام میں بنیادی اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ چنانچہ یہ جملہ امور اِن دونوں میں بالکل جدا جدا ہیں۔

اسلام کے ان دونوں معاشی نظاموں کو کوئی چاہے تو یوں کہہ لے کہ یہ دونوں ایک ہی نظام کے دو رُخ ہیں' لیکن بہرحال ان کے علیحدہ علیحدہ وجود سے انکار ممکن نہیں۔ البتہ یہ دونوں نظام ایک دوسرے سے interconnected (باہم مربوط) بھی ہیں اور بہت حد تک interdependent بھی۔ اور اسلام کی اصل برکات اور اس کے جملہ ثمرات کا کامل ظہور ان دونوں کے اجتماع اور اتصال ہی سے ہو سکتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ اگر ان دونوں میں سے ایک پہلو نگاہوں سے اوجھل ہو

جائے اور توجہ صرف دوسرے پر مرکوز ہو جائے تو اس سے جو تصویر سامنے آئے گی وہ اصل حقیقت سے بہت دُور ہو گی۔ ان میں سے ایک اسلام کا روحانی و اخلاقی نظام ہے اور دوسرا قانونی و فقہی نظام۔ اور ان دونوں کے تقاضے بسا اوقات مختلف ہی نہیں متضاد ہوتے ہیں۔ تاہم ان دونوں کے امتزاج سے اسلام کا کامل نظام وجود میں آتا ہے۔ آپ چاہیں تو ان دونوں پہلوؤں کو ''دعویٰ'' (Thesis) اور ''جوابِ دعویٰ'' (Anti-Thesis) سے تعبیر فرما لیں اور اسلام کے مجموعی اقتصادی نظام کو ان دونوں کا امتزاج (Synthesis) قرار دے لیں۔

اسلام کی قانونی اور اخلاقی تعلیمات کے مابین جو فرق و تفاوت بہت سے معاملات میں موجود ہے' وہ ایک چھوٹی اور سادہ سی مثال سے واضح ہو جائے گا۔ فرض کیجئے کہ کوئی شخص آپ کے ایک تھپڑ مار دے تو اگر آپ بالکل ہی عاجز و کمزور ہوں تو اس صورت میں تو ظاہر ہے کہ ''قہرِ درویش بر جانِ درویش'' کے سوا اور کوئی صورت قابل عمل ہے ہی نہیں۔ لیکن اگر آپ بدلہ لینے پر قادر ہوں تو آپ کے سامنے دو راستے کھلے ہوں گے: ایک یہ کہ آپ بدلہ لے لیں اور دوسرے یہ کہ آپ معاف کر دیں۔ اس صورت میں ایک جانب اسلام کا قانونی اور فقہی نظام ہے جو بدلے اور قصاص کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم فرماتا ہے: ﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰـاُولِي الْاَلْبَابِ﴾ (البقرۃ:۱۷۹) یعنی ''اے ہوش مندو! تمہارے لئے قصاص ہی میں زندگی ہے!'' لیکن دوسری طرف اسلام کا اخلاقی اور روحانی نظام ہے جو عفو و درگزر کی تلقین کرتا ہے' یعنی اگر معاف کر دو تو یہ تقویٰ اور خدا ترسی سے قریب تر ہے۔ چنانچہ کہیں تو شوق اور رغبت دلانے کے انداز میں فرمایا جاتا ہے ﴿وَالْكٰـظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ﴾ (آل عمران:۱۳۴) یعنی ''وہ لوگ جو غصہ کو پی جائیں اور لوگوں کو معاف کر دیا کریں۔'' اور کہیں اس سے بھی زیادہ زوردار الفاظ میں ترغیب دی جاتی ہے کہ ﴿وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾ (التغابن:۱۴) یعنی ''اگر تم معاف کر دیا کرو' اور چشم پوشی سے کام لو' اور خطائیں بخش دیا

کرو تو یقیناً اللہ بھی غفور و رحیم ہے!‘‘ —— دیکھ لیجئے کہ عفو و قصاص ایک دوسرے کی بالکل ضد ہیں‘ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ انسانی معاشرہ ان دونوں میں سے صرف ایک پر استوار ہو سکتا ہے۔ دونوں اپنے اپنے مقام پر لازم و ناگزیر ہیں اور حسنِ معاشرت ان دونوں کے امتزاج ہی سے وجود میں آتا ہے۔

اس پر قیاس کر کے سمجھ لینا چاہئے کہ اسلام کے معاشی نظام کے بھی دو پہلو ہیں‘ چنانچہ ایک جانب قانونی اور فقہی نظامِ معیشت ہے جس کے بارے میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ ایک نوع کی محدود (Controlled) اور داخلی طور پر منضبط (Internally managed) سرمایہ داری (Capitalism) ہے‘ اس لئے کہ اس میں انفرادی سرمایہ کاری کی اجازت موجود ہے‘ اگرچہ اسے ’’سرمایہ دارانہ نظام‘‘ بننے سے بعض تحدیدی اقدامات نے روک دیا ہے۔ دوسری طرف اسلام کا روحانی و اخلاقی نظامِ معیشت ہے جس کے بارے میں پورے انشراحِ صدر سے عرض کرتا ہوں کہ وہ ایک نہایت اعلیٰ قسم کی روحانی اشتراکیت (Spiritual Socialism) ہے اور ایک ایسا کامل سوشلزم ہے کہ اس سے بلند تر سوشلزم کا تصور ممکن ہی نہیں۔ اس لئے کہ سوشلزم یا کمیونزم میں تو پھر بھی انسانی ملکیت کا اثبات موجود ہے‘ اگرچہ انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی‘ لیکن اسلام اپنی اخلاقی و روحانی اور صحیح تر الفاظ ’’ایمانی تعلیم‘‘ کی رو سے انسانی ملکیت کی کلی نفی کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں بار بار یہ الفاظ آتے ہیں کہ ﴿لِلّٰہِ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ’’آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اس سب کا مالک صرف اللہ ہے‘‘۔ چنانچہ انسان کسی اور شے کا مالک تو کیا ہوگا‘ خواہ وہ زمین ہو یا مکان‘ اور ساز و سامان ہو یا روپیہ پیسہ‘ وہ تو خود اپنا اور اپنے وجود کا مالک بھی نہیں‘ اس کے ہاتھ پاؤں‘ اعضاء و جوارح اور جسم و جان اور اس کی کُل صلاحیتیں اور توانائیاں سب اللہ کی ملکیت ہیں اور وہ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتا ہے کہ میں ان کا امین ہوں۔ بقول شیخ سعدی۔

ایں امانت چند روزہ نزدِ ماست
درحقیقت مالکِ ہر شے خداست

یا بقول علامہ اقبال ۔

رزقِ خود را از زمیں بردن رواست
ایں متاعِ بندہ و ملکِ خداست

اس اعتبار سے ہمارے ہاں بڑا کنفیوژن پایا جاتا ہے۔ سوشلسٹ ذہن رکھنے والے اہلِ قلم متذکرہ بالا مضمون کی آیات اور احادیث کو اکٹھا کر کے ہر شے کی ملکیت کی بھی کامل نفی کرتے رہے ہیں اور ضرورت سے زائد اپنے پاس رکھنے کی بھی' کہ جب ﴿قُلِ الْعَفْوَ﴾ (البقرہ:۲۱۹) فرمادیا گیا' یعنی جتنا ضرورت سے زائد ہے اللہ کی راہ میں دے ڈالو۔ تو زائد چیز جبراً بھی وصول کر لی جائے گی۔ اس طرح وہ ایک کامل اسلامی سوشلزم کا نقشہ پیش کرتے رہے جب کہ دوسرے پہلو کو بالکل نظر انداز کرتے رہے۔ حالانکہ قانونِ وراثت بھی اسی قرآن میں موجود ہے' اور حضور اکرم ﷺ نے جو نظام برپا کیا تھا اس میں کہیں جبری مساوات دکھائی نہیں دیتی۔ بلکہ اس کے برعکس آزاد معیشت کے مواقع دیئے گئے تھے' کہ محنت کرو اور جائز ذرائع سے کماؤ' اور ان ذرائع سے تم جو کچھ کماؤ گے اس پر تمہارا حقِ تصرف یہاں تک تسلیم کیا جائے گا کہ اس کو وراثت میں منتقل بھی کیا جاسکے۔ دوسری طرف ہمارے ہاں بعض مفکرین اور اصحابِ قلم نے صرف اس قانونی نظام کو اتنا نمایاں کیا ہے کہ دوسرا پہلو دب کر رہ گیا ہے۔ یعنی ﴿قُلِ الْعَفْوَ﴾ کی آیت ان کی تقریر و تحریر میں آتی ہی نہیں!

یاد رہے کہ یہ کنفیوژن (الجھن) پورے خلوص کے ساتھ محض غلط فہمی کی بنیاد پر بھی ہوسکتی ہے۔ اس وضاحت کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ یہ غلط فہمی ہمارے دورِ اوّل یعنی خلافتِ راشدہ کے دوران بھی پیدا ہوگئی تھی' چنانچہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے غلبۂ زہد کے باعث یہ رائے قائم کر لی تھی کہ ضرورت سے زائد اشیائے صرف اور کسی بھی مقدار میں سونا اور چاندی اپنے پاس رکھنے کی قطعاً اجازت نہیں۔ گویا آپؓ نے آیۂ کنز یعنی سورۃ التوبہ کی آیت ۳۴:

﴿وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا یُنْفِقُوْنَھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ۝﴾

''جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں
کرتے انہیں دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دیجئے!''

کو بالکل اس کے ظاہری الفاظ پر محمول کیا۔ چنانچہ خلافتِ راشدہ کے اس نظام میں جس پر تمام اُمت جمع تھی' اس رائے کو ایک انتہا پسندانہ موقف قرار دیا گیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں انہیں مدینہ منورہ سے باہر چلے جانے کی ہدایت بھی کی گئی۔ لہٰذا انہوں نے ایک بیابان میں جھونپڑا ڈالا اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے احساس کی شدت کا یہ عالم تھا کہ وفات کے قریب آپؓ نے اپنی زوجہ محترمہ سے فرمایا کہ ''میرے خلیل (یعنی نبی اکرم ﷺ) نے فرمایا تھا کہ مسلمانو! تم اپنے اردگرد سانپ بچھو (یعنی سامانِ تعیش) جمع کرلو گے۔ افسوس کہ ہم نے بھی سانپ اور بچھو اپنے گرد جمع کر لئے ہیں''۔ تو انہوں نے کہا کہ کہاں ہیں وہ سانپ اور بچھو؟ تو آپؓ نے معمولی چیزوں جیسے توا' چمٹا اور دیگچی کا حوالہ دے کر کہا: یہ نہیں پڑے ہوئے میرے گرد! حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے اسی غلبۂ زہد کی وجہ سے آنحضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ ''تم میں سے جو چاہے کہ حضرت عیسیٰؑ کا زہد اپنی آنکھوں سے دیکھے تو اسے چاہئے کہ وہ میرے دوست ابوذرؓ کو دیکھ لے''۔ بہرحال یہ نظامِ اسلامی کا وہ روحانی پہلو ہے جس کی طرف اسلام انسانوں کو ترغیب تو دینا چاہتا ہے کہ یہی وہ راستہ ہے جس کے ذریعے انسان اپنے تزکیہ اور روحانی مراتب کے حصول کے لئے آگے بڑھ سکتا ہے' مگر اس کو قانونی درجہ دے دینا ایک مغالطہ تھا جو حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو پورے خلوص اور اخلاص کے ساتھ لاحق ہوا۔ لیکن عہدِ حاضر میں یہ مغالطہ جان بوجھ کر اور بدنیتی کے ساتھ دیا جاتا رہا ہے' کیونکہ آج تو خلافتِ راشدہ کا نظام پورے کا پورا ہمارے علم میں موجود ہے اور اُمت کے اس اجماعی فیصلے کو بغیر بدنیتی کے نظر انداز کرنا ممکن نہیں ہے۔

بہرحال اسلام کے اس روحانی معاشی نظام کے چار اصول ذہن میں اچھی طرح مرتب اور مستحضر کر لئے جائیں:

۱) انسانی ملکیت کی کلی نفی۔

۲) یہ یقین کہ انسان کو اس دنیا میں جو کچھ ملتا ہے اس کی کمائی نہیں، اللہ کا فضل ہے۔ گو دکان پر وہ بیٹھا ہے، کھیت میں ہل اس نے چلایا ہے، محنت اس نے کی ہے، لیکن ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ جو کچھ ملا ہے اس کو اللہ کا عطیہ اور اس کا فضل سمجھو۔ اگر اسے اپنی محنت کا ثمرہ سمجھو گے تو اس پر اپنا حق ملکیت جتاؤ گے اور اس کا منطقی نتیجہ یہ ہوگا کہ تم بھی وہی سمجھو گے جو قومِ شعیبؑ نے سمجھا تھا کہ ﴿اَنْ نَّفْعَلَ فِیْ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا﴾ (ہود: ۸۷) یعنی یہ کہ ہمیں اختیار ہونا چاہئے کہ اپنے مال میں جیسے چاہیں تصرف کریں لیکن اگر اللہ کا فضل سمجھو گے تو اس میں تصرف بھی اصل مالک اور عطا کنندہ کی مرضی کے مطابق کرو گے۔

۳) اللہ کے اس ''فضل'' میں سے انسان کا جائز حق صرف اس کی ضروریات کے بقدر ہے، اور ان بنیادی انسانی ضرورتوں کو بھی بعض احادیث میں متعین کر دیا گیا ہے۔ یعنی:

ا: اگر دو وقت کھانے کے لئے مل گیا ہے۔

ب: سر چھپانے کے لئے اگر کوئی چھت موجود ہے۔

ج: پہننے کے لئے اگر دو جوڑے کپڑوں کے موجود ہیں۔ اور

د: اپنے کردار، اخلاق اور عفت کی حفاظت کے لئے اگر ایک بیوی بھی موجود ہے تو تمہارا بنیادی حق تمہیں مل گیا۔

۴) اس بنیادی ضرورت سے زائد جو کچھ ہے اس کے بارے میں اخلاقی یا روحانی سطح پر اسلامی کی تعلیم یہ ہے کہ وہ خواہ قانونی اعتبار سے تمہارا ہو، حقیقت کے اعتبار سے تمہارا نہیں، دوسروں کا حق ہے۔ اس کو اُن لوگوں تک پہنچا دو جن کے پاس بنیادی ضرورت کے بقدر بھی موجود نہیں ہے اور پھر سمجھو کہ تم غریبوں کی اس امانت کے بوجھ سے سبکدوش ہو گئے جو تمہارے امتحان کی غرض سے تمہارے مال میں شامل کر دی گئی تھی۔

الغرض، یہ ہے وہ مقام جہاں ﴿قُلِ الْعَفْوَ﴾ کا فلسفہ بندۂ مؤمن کو پہنچانا چاہتا ہے،

یعنی یہ کہ تمہارے پاس جو بھی ''قدرِ زائد'' ہے اس کو مزید کمائی کا ذریعہ نہ بناؤ۔ تمہاری ضرورت پوری ہو گئی تو تمہارا حق مکمل ہو گیا' اب جو زائد تمہارے پاس ہے وہ خواہ قانوناً تمہارا ہو مگر حقیقتاً تمہارا نہیں ہے۔

بہرحال یہ ایک مکمل معاشی نظام ہے۔ اس میں ملکیت اور قدرِ زائد کا اپنا جداگانہ تصور ہے' اور اس قدرِ زائد کا مصرف بھی طے شدہ ہے۔ اور سب جانتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے خود اسی نظام کے مطابق زندگی بسر کی تھی۔ چنانچہ یہ بات بہت سے لوگوں کے لئے جنہوں نے اس سے قبل ان معاملات پر غور نہ کیا ہو' بہت حیران کن ہو گی کہ نبی اکرم ﷺ نے تمام عمر ''زکوٰۃ'' ادا نہیں کی۔ اس لئے کہ زکوٰۃ تو ظاہر ہے کہ صرف صاحبِ نصاب پر عائد ہوتی ہے اور آپ ؐ نے کبھی کوئی درہم و دینار اپنے پاس رکھا ہی نہیں کہ اس کی نوبت آ سکتی۔ لیکن یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ اس نظام کی ساری خوبی اور اس کا کُل حسن اس کے ''رضا کارانہ'' (voluntary) ہونے میں مضمر ہے۔ اسے کسی ادنیٰ درجہ میں بھی بالجبر نافذ کرنے کی کوشش کی جائے تو نتیجہ وہی نکلے گا جو کمیونزم کے حشر کی صورت میں سامنے آ چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں ہمیں دونوں طرح کے حضرات نظر آتے ہیں۔ وہ بھی جنہیں عرفِ عام میں فقراءِ صحابہ کہا جاتا ہے' جنہوں نے اسی ''اختیاری فقر'' کے نظام کو عملاً اختیار کیا جن کے سرخیل حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ تھے' اور وہ بھی ہیں جنہوں نے اپنا عام چلن تو اسلام کے قانونی اور فقہی نظام کے مطابق رکھا جس سے ان کے پاس سرمایہ جمع بھی ہوا' لیکن جب بھی جہاد اور قتال فی سبیل اللہ کے لئے ضرورت پیش آئی انہوں نے اپنا مال حاضر کر دیا۔ دورِ صحابہؓ کے بعد اسی ''اختیاری فقر'' اور ''رضا کارانہ سوشلزم'' پر صوفیائے کرام کا عمل رہا۔ اور کون نہیں جانتا کہ دورِ صحابہؓ کے بعد اسلام کی تبلیغ و توسیع کا سارا معاملہ ان ہی حضرات کی مساعی کا مرہونِ منت ہے۔

قرآن حکیم کے فلسفہ و حکمت سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے ایمانی اور روحانی سطح پر قرآن کی معاشی تعلیمات پر غور و فکر کے ضمن میں سورۃ الروم کی آیت ۳۹ بہت

توجہ اور غور کے قابل ہے جس میں ''ربا'' (سود) کا ذکر بمقابلہ صدقات آیا ہے:

﴿وَمَا اٰتَیْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّیَرْبُوَا فِیْ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا یَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَا اٰتَیْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِیْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ۝﴾

''اور جو تم دیتے ہو سود پر کہ بڑھتا رہے لوگوں کے مال میں سو وہ نہیں بڑھتا اللہ کے یہاں' اور جو دیتے ہو زکوٰۃ سے اللہ کی رضامندی چاہتے ہوئے' سو یہ وہی ہیں جو (اپنے مال کو) بڑھانے والے ہیں۔''

گویا دین کی روحانی تعلیم کے اعتبار سے ''ربا'' درحقیقت صدقہ اور خیرات کے بالمقابل ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص کہیں ملازم ہے اور اس کو ماہانہ تنخواہ ملتی ہے جس سے اس کی ضروریات پوری ہو رہی ہیں لیکن کچھ اضافی سرمایہ اس کے پاس جمع ہو گیا ہے۔ اس فاضل سرمایہ کے دو مصرف ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس کو کسی اور کے کاروبار میں لگا کر اس کی محنت کے بل بوتے پر اس سرمایہ کو بڑھائے (وہ خود تو محنت نہیں کرے گا کیونکہ وہ تو کسی اور جگہ ملازم ہے) تو اگرچہ یہ قانونی اور فقہی سطح پر جائز اور درست ہے لیکن روحانی سطح پر یہ بھی ''ربا'' ہی قرار پائے گا' کیونکہ اس روحانی اور اخلاقی سطح پر اس فاضل سرمائے کا صحیح مصرف یہ ہے کہ اوّل تو اس کا مالک ہی محتاجوں اور غریبوں کو بنا دیا جائے' یعنی ایسے لوگوں کو دے دیا جائے جو محروم ہیں یا جن کے پاس کاروبار کے لئے بنیادی سرمایہ موجود نہیں ہے' یا بدرجۂ آخر ''قرضِ حسن'' کی صورت میں دے دیا جائے تاکہ وہ اس کے ذریعے اپنا کاروبار چلا کر اسے واپس لوٹا دیں۔ اس سے آگے بڑھ کر فاضل سرمائے کو مزید آمدنی کا ذریعہ بنانا قانونی سطح پر تو جائز ہو سکتا ہے مگر روحانی اور اخلاقی سطح پر یہ چیز بھی ممنوعات کی فہرست میں داخل ہے۔

اسلام کا قانونی نظامِ معیشت

اخلاقی اور روحانی یا قرآن و حدیث کی مخصوص اصطلاح میں ایمانی اور احسانی سطح پر اسلام کی معاشی تعلیمات کے ضمن میں دو امور تو اس سے قبل واضح کیے جا چکے ہیں، یعنی:

۱) ایک یہ کہ یہ ایک مکمل معاشی نظریہ اور نظام ہے جس کے چار بنیادی اصول یہ ہیں کہ (i) اس پوری کائنات میں ملکیت کا کامل اور مطلق حق صرف اللہ کو حاصل ہے، انسان کو یہ حق نہ انفرادی سطح پر حاصل ہے نہ اجتماعی یا قومی سطح پر، بلکہ انسان کو صرف حق ''امانت'' حاصل ہے۔ (ii) اس دنیا میں کسی انسان کو جو کچھ ملتا ہے، خواہ اس کے لئے اس نے خود شدید محنت کی ہو اور مشقت جھیلی ہو، وہ اس کی ''کمائی'' نہیں بلکہ اللہ کا ''فضل'' ہے۔ (iii) اس فضل خداوندی میں سے انسان کا جائز حق صرف اس کی ''ضروریات'' کی حد تک ہے۔ (iv) اس سے زائد جو کچھ ہے وہ اُس کا نہیں بلکہ حقیقت میں فقراء اور مساکین یا سائلین اور محرومین کا حق ہے جو اُس کے مال میں صرف اس امتحان کی غرض سے شامل کر دیا گیا ہے کہ دیکھیں کہ آیا وہ پوری امانت داری کے ساتھ اصل حق داروں کو ان کا حق پہنچا کر سبکدوش اور سرخرو ہو جاتا ہے یا اس پر اپنے ''قبضہ مخالفانہ'' کے ذریعے اپنے آپ کو اخلاق کی بالیدگی اور روحانی ترفع سے محروم کر لیتا ہے۔

۲) دوسرے یہ کہ نبی اکرم ﷺ اور بہت سے صحابہؓ نے اسی ''اختیاری فقر'' کو اپنا شعار بنائے رکھا۔ اور دَورِ صحابہؓ کے بعد اولیاء اللہ اور صوفیائے کرام نے بھی ع ''مرا طریق امیری نہیں، فقیری ہے!'' کے مصداق اسی سطح پر زندگیاں بسر کیں۔ البتہ یہ واضح رہنا چاہئے کہ یہ معاملہ خالص اختیاری (Voluntary) ہے۔ اور

اس میں قانونی یا ریاستی جبر کا ادنیٰ شائبہ بھی شامل ہو جائے تو نہ صرف یہ کہ اس کا اصل ''حسن'' ختم ہو جائے گا بلکہ اس کا بنیادی مقصد ہی فوت ہو کر رہ جائے گا۔

ان دو امور پر ایک تیسری حقیقت کا اضافہ کر لیا جائے۔ اور وہ یہ کہ اگرچہ اس سطح پر زندگی بسر کرنا بلاشبہ ایک نہایت اقل قلیل اقلیت ہی کے لئے ممکن ہے' لیکن واقعہ یہ ہے کہ اگر کسی معاشرے میں لاکھوں میں سے ایک شخص بھی اس سطح پر زندگی گزار رہا ہو تو ایسے لوگ اس معاشرے میں اخلاقی اور روحانی اقدار کے زندہ اور برقرار رکھنے کا مؤثر ذریعہ بن جاتے ہیں اور انہیں گویا اس معاشرے میں ایک قسم کے اخلاقی و روحانی Pace-makers کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ عوام الناس میں ہر دلعزیزی اور مقبولیت انہیں حاصل ہوتی ہے نہ کہ اصحابِ دولت اور اربابِ اقتدار کو۔ اور حقیقی معنی میں تعظیم اور تکریم ان کی ہوتی ہے نہ کہ صاحبانِ تخت و تاج اور اصحابِ دولت و ثروت کی' بلکہ بسا اوقات بڑے بڑے شہنشاہ اور کج کلاہ ان خرقہ پوش اور بوریا نشین فقیروں کے در پر حاضری کو اپنے لئے موجب سعادت سمجھتے ہیں۔ جیسے کہ بالکل صحیح فرمایا علامہ اقبال نے کہ ؎

یقیں پیدا کر اے ناداں' یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری!

چنانچہ نہایت مشہور واقعہ ہے کہ حج کے موقع پر لوگوں کا رجوعِ عام اور خلقت کا اژدھام ایک صاحب علم و فضل کے گرد دیکھ کر ہارون الرشید جیسے عظیم حکمران سے اس کی محبوب بیگم ملکہ زبیدہ نے کہا تھا: ''اصل حکومت تو ان کی ہے نہ کہ تمہاری!'' پھر چند سو سال بعد کا واقعہ ہے کہ برعظیم ہند کے پایۂ تخت دہلی میں طویل عرصے تک دو متوازی حکومتیں قائم رہیں' ایک سیاسی اور عسکری حکومت اور دوسری اخلاقی اور روحانی حکومت' اور مؤخر الذکر حکومت کے ایک ''تاجدار'' سلطان الہند حضرت نظام الدین اولیاء کے ''عہد حکومت'' کے دوران چھ یا سات بادشاہ سیاسی اور عسکری حکومت کے تخت پر بیٹھے' لیکن نہ صرف یہ کہ حضرت نظام الدین نے کبھی کسی بادشاہ کے دربار میں حاضری نہیں دی بلکہ

بعض کی شدید خواہش کے باوجود انہیں اپنے یہاں حاضر ہونے کی اجازت بھی مرحمت نہیں فرمائی...... اور یہ تو بالکل ماضی قریب کا واقعہ ہے کہ گزشتہ صدی کے دوران سلسلہ مجددیہ نقشبندیہ کے بزرگ حضرت شاہ غلام علیؒ نے ریاست ٹونک کے والی نواب امیر خان کی جانب سے خانقاہ کے مصارف کے لئے ایک جاگیر کا وثیقہ اس کی پشت پر یہ شعر لکھ کر واپس کر دیا تھا کہ ؎

ما آبروئے فقر و قناعت نہ باختیم
با میر خاں بگوئے کہ روزی مقدر است

یعنی ''ہم یہ جاگیر قبول کر کے اپنے فقر اور درویشی کی عزت و آبرو کا سودا کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ امیر خان سے کہہ دیا جائے کہ ہماری روزی ہمارے پروردگار کی جانب سے مقرر ہے''۔

چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ آج ہم قومی سطح پر اخلاق کے جس خوفناک زوال اور روحانیت کے جس شدید فقدان سے دوچار ہیں اس کا ایک اہم سبب یہی ہے کہ آج لاکھوں کیا کروڑوں میں بھی کوئی ایک انسان اس سطح پر زندگی گزارتا نظر نہیں آتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں عزت و احترام کی بنیاد صرف دولت و ثروت اور حکومت و اقتدار بن کر رہ گئے ہیں' حالانکہ لوگوں کو خوب معلوم ہوتا ہے کہ یہ دولت حرام اور ناجائز ذرائع سے کمائی گئی ہے اور یہ اقتدار بھی ''دھن' دھونس اور دھاندلی'' کے ذریعے حاصل کیا گیا ہے۔

اور اب آیئے قانونی اور فقہی سطح پر اسلام کی معاشی تعلیمات کی جانب! جیسے کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے' قانونی سطح پر اسلام کا معاشی نظام ایک محدود اور مقید (Controlled) اور اندرونی طور پر منضبط (Internally Managed) سرمایہ دارانہ معیشت (Capitalism) کی حیثیت رکھتا ہے۔

تو آیئے کہ سب سے پہلے یہ دیکھیں کہ یہ ''کیپٹل ازم'' سے کیوں اور کیسے مشابہ ہے؟ یہ بنیادی طور پر کیپٹل ازم سے اس لئے مشابہ ہے کہ اس میں وہ چاروں بنیادی

اوصاف موجود ہیں جو مغرب کے سرمایہ دارانہ معاشی نظام میں بھی موجود ہیں اور درحقیقت ان ہی کی بنیاد پر اسے کمیونزم پر وہ فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی ہے جس کا جشن آج پوری مغربی دنیا اور خصوصاً اس کے امام اور قائد امریکہ میں جوش وخروش سے منایا جا رہا ہے۔ اس لئے کہ ان اوصاف کے ذریعے ایک جانب انسان کی بعض حیوانی جبلتوں کو بھرپور تسکین حاصل ہو جاتی ہے تو دوسری جانب ایک مسلسل مقابلے اور مسابقت کا بازار گرم رہتا ہے جس کے باعث معاشی میدان میں تیز رفتاری اور حرکت پیدا ہو جاتی ہے اور ہر نوع کی پیداوار میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ وہ چار بنیادی اوصاف حسب ذیل ہیں:

۱) جملہ عملی اور قانونی تقاضوں کے اعتبار سے ذاتی اور نجی ملکیت (Private ownership) کا اثبات' جو صرف اشیائے صرف یعنی استعمال کی چیزوں ہی پر نہیں' جملہ ذرائع پیداوار جیسے کھیت' دکان اور کارخانہ پر بھی حاوی ہے۔

۲) ذاتی منفعت اور شخصی مفاد کے باعث اضافی محنت ومشقت اور زیادہ جان مار کر کام کرنے کا جذبہ یعنی ذاتی حوصلہ مندی (Personal Incentive) جس سے پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے۔ پھر اس پر مستزاد کھلا مقابلہ اور آزادانہ مسابقت (Open competition) جس سے نفع کی شرح خود بخود کم ہو جاتی ہے اور صارفین کو فائدہ پہنچتا ہے۔

۳) اشیاء کی قیمتوں کے تعین میں کسی مصنوعی کنٹرول کی بجائے طلب (Demand) اور رسد (Supply) کے عوامل کا آزادانہ بروئے کار آنا' یعنی ''منڈی کی معیشت'' (Market Economy) کا اصول!

۴) اسی طرح آجری اور مستاجری یعنی کارکنوں کی مزدوری اور ملازمت کے معاملات میں بھی مصنوعی پابندیوں اور قدغنوں سے اجتناب۔ اور ملازم رکھنے والوں (Employers) کے لئے ''رکھنے یا فارغ کر دینے'' کی کھلی آزادی یعنی Hire and Fire کا آزادانہ اختیار (بشرطیکہ اس کے ساتھ ''بیروزگار'' لوگوں

کے لئے ریاستی کفالت کی ضمانت موجود ہو!)

جیسے کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے' ان چاروں چیزوں کا نہایت گہرا تعلق انسان کی حیوانی جبلتوں کے ساتھ ہے اور یہ انسانی سرشت کے ساتھ کامل مطابقت رکھتی ہیں۔ چنانچہ ان ہی کو نظر انداز کر کے کمیونزم نے گویا اپنے ہاتھوں اپنی قبر کھودی ہے۔ اور ان ہی کے باعث مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام کو وہ فتح حاصل ہوئی ہے جس پر وہ بغلیں بجا رہا ہے حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ بعض دوسرے اعتبارات سے مغرب کی سرمایہ دارانہ معیشت نہایت ظالمانہ اور حد درجہ استحصالی مزاج کی حامل ہے۔ چنانچہ کمیونزم کا ظہور بذاتِ خود سرمایہ دارانہ نظام کے اسی ظلم اور استحصال کے خلاف ''ردِّ عمل'' کی حیثیت رکھتا تھا جو ع ''انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات!'' کے مصداق ردِّ عمل کی طبعی و فطری انتہا پسندی کی بنا پر شکست کھا گیا۔ اس لئے کہ اس نے اپنی اس انتہا پسندی کے باعث انسان کی حیوانی جبلتوں کو نظر انداز کر دیا۔

بہر حال اسلام کے قانونی نظامِ معیشت میں یہ چاروں اصول بتمام وکمال موجود ہیں جن کی بناء پر اسے مغرب کی سرمایہ دارانہ معیشت کے ساتھ ایک گونہ مماثلت حاصل ہے۔

اب ہماری اصل گفتگو تو شریعت اسلامی کے ان احکام اور اقدامات کے بارے میں ہوگی جن کی بناء پر ہم اسلام کے قانونی نظام معیشت کو ''محدود اور مقید'' سرمایہ دارانہ معیشت قرار دیتے ہیں۔ اور جن کا اصل مصرف اور بنیادی مقصد یہ ہے کہ معیشت کے میدان میں ''سرمایہ کاری'' کی فضا تو بھرپور طور پر برقرار رہے لیکن ''سرمایہ'' استحصال کا آلہ نہ بن جائے اور ''سرمایہ داری'' آکاس بیل کی صورت اختیار کر کے پوری معیشت کا خون نہ چوس لے' لیکن مناسب ہے کہ پہلے اس دوسرے پہلو پر غور کر لیا جائے جو بنیادی طور پر تو اسلام کے قانونی نظامِ معیشت اور مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام میں قدرِ مشترک کے طور پر موجود ہے' تاہم متعدد اعتبارات سے ان کے مابین ''چہ نسبت خاک را با عالم پاک'' والا معاملہ ہے اور وہ ہے سرمایہ دارانہ نظام کا داخلی انضباط۔

اس کی جڑ اور بنیاد یہ ہے کہ جہاں بھی شخصی ملکیت' ذاتی حوصلہ مندی اور آزادانہ مسابقت کا معاملہ ہوگا' لوگوں کے مابین ذہانت وصلاحیت اور محنت ومشقت کے طبعی فرق وتفاوت کے باعث معاشی اونچ نیچ پیدا ہو کر رہے گی۔ جسے ایک حد کے اندر اندر رکھنا معاشرے کی مجموعی صحت اور زندگی کے لئے لازمی ہے۔ اس لئے کہ اگر یہ خلیج زیادہ بڑھ جائے تو معاشرے میں ''مترفین'' یعنی Haves اور ''محرومین'' یعنی Have - nots کے طبقات پیدا ہو جائیں گے جو طبقاتی کشمکش کا باعث بنیں گے اور اس سے معاشرہ شکست و ریخت کا شکار ہو جائے گا۔ چنانچہ اسی ضرورت کے تحت مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام نے کہیں ''بے روزگاری الاؤنس'' کے نام سے (جیسے برطانیہ میں ہے) اور کہیں ''ویلفیئر'' کے نام سے (جیسے امریکہ اور بعض یورپی ممالک میں ہے) سرمایہ دارانہ نظام کے ''اندرونی انضباط'' کی کوشش کی ہے جس کی سطح کے اعتبار سے اس اصول کے تحت کہ ''شیطان کو بھی اس کا جائز حق ضرور دیا جائے'' یہ تسلیم کیا جانا چاہئے کہ بعض یورپی ممالک جیسے سویڈن' ناروے اور ڈنمارک ایک بار تو ناقابل یقین بلندی کی حدوں تک پہنچ گئے تھے تاہم چونکہ یہ معاملہ غیر فطری اور غیر طبعی تھا لہٰذا اب کسی قدر نیچے اترنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔

شریعتِ اسلامی نے یہی ضرورت زکوٰۃ کے نظام کے ذریعے پوری کی ہے جس کے بارے میں نبی اکرم ﷺ کا نہایت حکیمانہ قول ہے کہ ((تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِيَاءِ هِمْ وَ تُرَدُّ اِلٰی فُقَرَاءِ هِمْ)) (صحیح بخاری' عن ابن عباسؓ) یعنی ''وہ مسلمانوں کے مالدار لوگوں سے وصول کی جاتی ہے اور غرباء میں تقسیم کر دی جاتی ہے!'' اور اس سے نہ صرف یہ کہ آزاد معیشت کے ''داخلی انضباط'' کا وہ مقصد بتمام وکمال حاصل ہو جاتا ہے جس کی وضاحت اوپر کی گئی ہے' بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اسلامی ریاست فی الحقیقت ایک ویلفیئر سٹیٹ کی صورت اختیار کر لیتی ہے جو ''کفالت عامہ'' کی ذمہ داری جس حد تک قبول کرتی ہے اس کا کسی قدر اندازہ حضرت عمرؓ کے اس قول سے کیا جا سکتا ہے کہ ''اگر دجلہ وفرات کے کنارے کوئی کتا بھی بھوکا مر گیا تو قیامت کے روز عمرؓ ذمہ دار ہوگا''۔

زکوٰۃ کے نظام کی دوسری خصوصیت جو اسے مغرب کے ویلفیئر نظام سے مشابہ کرتی ہے یہ کہ اصولی اعتبار سے زکوٰۃ کی ادائیگی دوسرے صدقاتِ نافلہ کے برعکس افراد کی صوابدید پر نہیں چھوڑی گئی بلکہ یہ ایک خالص ریاستی معاملہ ہے۔ لہٰذا یہ صاحبِ نصاب لوگوں سے جبراً اور پورے حساب کتاب کے ساتھ وصول کی جاتی ہے۔ تاہم یہ معاملہ مصلحتِ عامہ کے پیشِ نظر صرف ''اموالِ ظاہرہ'' یعنی اموالِ تجارت وغیرہ کی حد تک محدود کر دیا گیا ہے اور ''اموالِ باطنہ'' جیسے وہ زیورات یا نقدی وغیرہ جو گھروں میں رکھی گئی ہو ان کی زکوٰۃ کی ادائیگی کو لوگوں کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ چاہیں تو حکومت کے حوالے کر دیں اور چاہیں تو خود ادا کر دیں (چنانچہ ایسے ہی اموال کی زکوٰۃ تھی جس کے بارے میں روایات میں آتا ہے کہ دَورِ خلافتِ راشدہ میں لوگ اسے لے کر پھرا کرتے تھے اور اس کا قبول کرنے والا نہیں ملتا تھا!)

بہرحال ان دو جزوی اور سطحی مشابہتوں کے علاوہ شریعتِ اسلامی کا نظامِ زکوٰۃ مغرب کے ویلفیئر کے نظام سے بہت اعلیٰ اور ارفع ہے' جس کے چند پہلو حسب ذیل ہیں:

i) زکوٰۃ عبادت ہے ٹیکس نہیں' لہٰذا جس شخص کے دل میں ذرا بھی ایمان ہوگا وہ زکوٰۃ پوری پوری ادا کرے گا جبکہ ٹیکس سے بچنے کی کوشش ایک قاعدہ کلیہ اور متفق علیہ معاملہ ہے۔ چنانچہ بالکل نماز کی طرح جس کی فرضیت قرآن کی جانب سے ہوئی اور اس کے اوقات و رکعات کا نظام نبی اکرم ﷺ نے عطا فرمایا' زکوٰۃ کی بھی فرضیت قرآن کے ذریعے ہوئی اور اس کے نصاب اور شرح کا نظام آنحضور ﷺ نے متعین فرمایا۔ اور جو لوگ اس نظام میں ردّوبدل کے جواز کے قائل ہیں وہ اپنی ناسمجھی میں زکوٰۃ کو ''عبادت'' کی بجائے ''ٹیکس'' کی صورت دے کر اس کی اصل روح کو ختم کر دینے کے درپے ہیں۔

ii) نظامِ زکوٰۃ کے اعتبار سے ''اغنیاء'' اور ''فقراء'' کا تعین صرف عرفِ عام میں نہیں چھوڑ دیا گیا کہ مالدار وہی سمجھا جائے جو لکھ پتی یا کروڑ پتی ہو اور فقیر وہی قرار دیا

جائے جسے فاقے آ رہے ہوں یا جو بھیک مانگتا پھر رہا ہو' بلکہ ''نصاب'' کی ایک لائن کھینچ دی گئی ہے کہ جو شخص بھی اس سے اوپر ہے وہ ''غنی'' یعنی زکوٰۃ کا ادا کنندہ (Donor) ہے اور جو اِس سے نیچے ہے وہ زکوٰۃ کا وصول کنندہ (Recipient) ہے۔ چنانچہ اس اصول کی بنیاد پر ایک مکمل سوشل انشورنس کا نظام قائم کیا جا سکتا ہے جس سے معاشرے میں Haves اور Have - nots کے مابین ایک حسین توازن قائم ہو جائے۔

iii) مغربی ممالک میں سوشل انشورنس کا اصل نظام لوگوں کی اپنی ادائیگی یعنی Contribution کی بنیاد پر قائم ہے' ورنہ خالص اور اصل ویلفیئر کی سطح تو بہت ہی کم یعنی صرف Subsistence Level پر ہے' جبکہ زکوٰۃ کے نظام میں اس کے حق داروں اور وصول کنندگان کی جانب سے کسی Contribution کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور ہر وہ شخص اس کا حق دار ہے جس کی اپنی مالی حیثیت کسی بھی سبب سے ''نصاب'' سے کمتر ہو۔

iv) تاہم شریعتِ اسلامی نے زکوٰۃ کے نظام میں ایک حسین توازن ایسے پیدا کر دیا ہے کہ زکوٰۃ وصدقات کو ''اَوْسَاخُ النَّاسِ'' یعنی لوگوں کا میل کچیل قرار دے کر نہ صرف لوگوں کو ترغیب دی ہے بلکہ ان کی غیرت کو جھنجوڑا ہے کہ اپنے ہاتھوں کی محنت سے معاش حاصل کر کے خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی کوشش کرو اور لوگوں کے میل کچیل سے اپنے پیٹ مت بھرو۔

چنانچہ اسی معاملے میں مزید زور پیدا کرنے کے لئے نبی اکرم ﷺ نے اپنی ذات اور اپنے خاندان کے لئے زکوٰۃ اور صدقات کو حرام قرار دے دیا۔ تاہم عام لوگوں کے اعتبار سے یہ بھی صرف ایک اخلاقی تعلیم ہے' قانون نہیں۔ البتہ اس سے اس اندیشے کا سدِ باب ہو جاتا ہے جس کے باعث سویڈن جیسے ملکوں کو ویلفیئر کی سطح کو نیچے لانا پڑ رہا ہے' یعنی جب بغیر محنت کئے بھی گزر بسر ہو جائے تو ''زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی' کیوں ترا راہگذر یاد آیا'' کے مصداق خواہ مخواہ زیادہ محنت اور مشقت کیوں

برداشت کی جائے۔ کیوں نہ ویلفیئر کو شیر مادر کی طرح ہضم کیا جائے۔

قصہ مختصر زکوٰۃ کا نظام اسلام کے قانونی نظامِ معیشت کا اہم ستون ہے جس سے اس کی ''آزاد معیشت'' سے پیدا شدہ معاشی ناہمواری کا ''داخلی انتظام و انضباط'' بطریق احسن ہو جاتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ صدیوں سے تو مسلمانوں نے اسے ذاتی خیرات کا معاملہ بنا رکھا تھا۔ اپنے دورِ حکومت میں جنرل ضیاء الحق مرحوم نے اسے بڑی آن بان اور شان کے ساتھ نافذ کیا تو اس طور سے کہ بس ایک منظم بھکاری پن (Organized Beggary) کی صورت پیدا ہو گئی اور ''بدنام کنندگان نکونامے چند!'' کے مصداق زکوٰۃ کے نظام ہی کو بدنام کر کے رکھ دیا۔

اب ان شاء اللہ آئندہ صفحات میں شریعت اسلامی کے ان احکام اور اقدامات پر گفتگو ہو گی جن کے ذریعے آزاد معیشت کے اسلامی نظام میں ''سرمایہ کاری'' کی فضا کو بھرپور طور پر برقرار رکھتے ہوئے ''سرمایہ داری'' کی لعنت کو وجود میں آنے سے روکا گیا ہے' جن میں سرفہرست سود کی حرمت ہے۔

سود اور جوئے کی حرمت کی حکمت

الحمد للہ کہ اس سے قبل حسبِ ذیل امور کی کسی قدر وضاحت ہو چکی ہے کہ:

۱) ایمان اور احسان کی سطح پر اسلام کی تعلیمات کا نقطۂ عروج ''اختیاری فقر'' ہے جو گویا روحانی سوشلزم کی بلند ترین صورت ہے۔

۲) عمومی اور قانونی سطح پر اسلام کا معاشی نظام مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام سے اس بنا پر بھی مشابہ ہے کہ اس میں نجی ملکیت' انفرادی حوصلہ مندی' آزادانہ مسابقت' منڈی کی معیشت اور ملازم رکھنے اور فارغ کر دینے کے اختیار کے وہ جملہ اصول موجود ہیں جن کو رد یا نظر انداز کرنے کی بنا پر کمیونزم کی موت واقع ہوئی اور اس کے مقابلے میں مغرب کے اس سرمایہ دارانہ نظام کو فتح حاصل ہوئی جس نے ان اصولوں کو اختیار کیا۔ اگرچہ وہ اپنی جگہ ایک نہایت ظالمانہ اور استحصالی نظام ہے۔

۳) مزید برآں' یہ مشابہت اس پہلو سے بھی ہے کہ مغربی سرمایہ دارانہ نظام نے اندرونی اور داخلی انضباط کی جس ضرورت کو بیروزگاری الاؤنس یا ویلفیئر یا اجتماعی انشورنس کے ذریعے پورا کرنے کی کوشش کی اسے اسلام نے اس سے کہیں اعلیٰ و ارفع اور زیادہ متوازن اور قابل عمل صورت میں زکوٰۃ کے نظام کے ذریعے باحسن وجوہ پورا کر دیا۔

اب آیئے کہ ہدایت خداوندی اور آسمانی شریعتوں یعنی شریعتِ موسویؑ اور شریعتِ محمدیؐ کے ان احکام پر غور کریں جن کے ذریعے خالص عقل انسانی کے اعتبار سے یہ ناممکن الحصول مقصد حاصل ہو جاتا ہے کہ ''سرمایہ کاری'' کی فضا کو بھرپور طور پر برقرار رکھنے کے باوجود ''سرمایہ داری'' کی لعنت پیدا نہ ہونے پائے۔ یعنی دولت کا ارتکاز ایک محدود حلقے میں نہ ہو بلکہ وہ پورے معاشرے میں توازن اور ہمواری کے

ساتھ گردش کرے۔

قرآنِ حکیم نے اس بنیادی مقصد کو سورۃ الحشر کی ساتویں آیت کے ان مختصر ترین الفاظ میں بیان کیا ہے کہ ﴿كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ﴾ یعنی ''تاکہ وہ (سرمایہ) تمہارے امیر لوگوں ہی کے مابین گردش میں نہ رہے''۔ اس عظیم مقصد کے حصول کے لئے خالص عقل انسانی کی رسائی کی آخری منزل یا ''معراج'' یقیناً مارکس کا فلسفہ اور کمیونزم کا نظام ہی تھا لیکن وہ حقائق و واقعات کی تجربہ گاہ میں ناکام ثابت ہو چکا ہے۔ لہٰذا اب اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ علامہ اقبال کے اس شعر کے مطابق کہ ؎

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغِ راہ ہے، منزل نہیں ہے!

عقل کی کوتاہی اور درماندگی کو تسلیم کر لیا جائے اور ہدایت آسمانی کی جانب رجوع کیا جائے۔

آسمانی شریعتوں نے اس مقصد عظیم کو چند مالی معاملات کو حرام اور ممنوع قرار دے کر حاصل کیا ہے جن میں سے Master-Stroke کی حیثیت سود اور جوئے کی حرمت کو حاصل ہے۔ چنانچہ ان دونوں ہی کو قرآن حکیم نے شیطانِ لعین کی جانب منسوب کیا ہے۔ جیسے کہ سود کے بارے میں سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۷۵ میں فرمایا:

﴿اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ﴾

''جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ (قیامت کے روز) نہیں اٹھیں گے مگر اُن لوگوں کے مانند جنہیں شیطان نے اپنی چھوت کے ذریعے پاگل بنا دیا ہو!''

اور سورۃ المائدہ کی آیات ۹۰ اور ۹۱ میں شراب وغیرہ کے ساتھ ساتھ جوئے کو بھی ان ''ناپاک شیطانی کاموں'' ﴿رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ﴾ میں شمار کیا گیا ہے جن کے ذریعے شیطان انسانوں میں ''عداوت اور بغض'' پیدا کرنا چاہتا ہے۔

تو اگرچہ ایک بندۂ مؤمن کے لئے تو حلت اور حرمت کے معاملے میں صرف اللہ

اور رسول ﷺ کا حکم ہی آخری، قطعی اور حتمی بات ہے جس پر مستزاد کسی عقلی اور منطقی دلیل کی کوئی حاجت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کچھ لوگوں نے یہ اعتراض وارد کیا کہ ﴿ اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ﴾ (البقرہ: ۲۷۶) ''بیع بھی تو ربا کے مثل ہی ہے'' تو اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے بیع اور ربا کے مابین فرق و تفاوت کو کسی عقلی اور منطقی دلیل کے ذریعے واضح نہیں فرمایا' بلکہ زجر اور ملامت کے انداز میں فرمایا: ﴿ وَاَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ﴾ ''حالانکہ اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اور ربا کو حرام!'' (اگرچہ اس کا ایک لطیف سبب یہ بھی ہے کہ سود کے گھناؤنے پن کو حرمتِ ربا کے آخری حکم کے نزول سے لگ بھگ پندرہ سال قبل سورۃ الروم کی ایک آیت میں ''عاقلاں را اشارہ کافی است!'' کے مطابق لطیف ترین اور مختصر ترین انداز میں واضح کر دیا گیا تھا' جس کا ذکر بعد میں کیا جائے گا!) تاہم چونکہ عہد حاضر میں عام طور پر لوگ عقلیت پسند سے بھی آگے بڑھ کر ''عقلیت پرست'' بن گئے ہیں' لہٰذا سود اور جوئے کی حرمت کی حکمت و علت کی کسی قدر عقلی وضاحت مناسب ہے۔

اس سلسلے میں یہ خالص فلسفیانہ بحث کہ اصل عامل پیداوار محنت ہے یا سرمایہ' جہاں ایک روزنامے کے کالموں کی حدود سے متجاوز ہے' وہاں انڈا پہلے تھا یا مرغی کے سوال کے مانند لایعنی اور لاحاصل بھی ہے۔ اسی طرح کسی منفعت بخش پیداواری عمل میں کس قدر حصہ سرمائے کا ہے اور کتنا محنت کا' اس کا یقینی اور حتمی تجزیہ بھی قطعاً ناممکن ہے۔ اصل مسئلے کے فہم کے لئے اس سادہ ترین بنیادی حقیقت کو سامنے رکھ لینا کافی ہے کہ ہر قابل لحاظ پیداواری عمل میں دو عوامل تو اساسی اور بنیادی طور پر لازماً شامل ہوتے ہیں' یعنی محنت اور سرمایہ' اور ایک تیسرا عامل بھی خواہ ثانوی درجہ ہی میں سہی بہرحال کسی نہ کسی حد تک ضرور موجود ہوتا ہے' یعنی ''موقع'' یا چانس۔ اور مالی معاملات میں شریعت الٰہی میں حلت اور حرمت کا اصل الاصول یہ ہے کہ اس میں زیادہ سے زیادہ زور بھی انسانی محنت پر دیا گیا ہے اور زیادہ سے زیادہ تحفظ بھی اسی کو فراہم کیا گیا ہے جبکہ سرمایہ کو بروئے کار آنے کی اجازت تو دی گئی ہے لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام

کے ﴿مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ﴾ جنات کے مانند کسی قدر پابند سلاسل کر کے' تا کہ یہ پیداواری عمل میں مناسب حصّہ تو ادا کرے' لیکن نہ محنت کا استحصال کر سکے نہ محنت کے بغیر محض موقع یا چانس کے رسک کے ذریعے افزائش وافزودگی حاصل کرنے کی کوشش کر سکے' اس لئے کہ انہی دو ذرائع کی بنا پر سرمایہ پوری معیشت پر آ کاس بیل کی طرح مسلط ہو جاتا ہے۔

ان میں سے جہاں تک مؤخر الذکر معاملے کا تعلق ہے اس کی حکمت وعلت تو اظہر من الشمس ہے' یعنی سرمایہ جب بغیر محنت کے محض موقع اور چانس کے رسک یعنی ''داؤ'' کے ذریعے کمائی کی کوشش کرتا ہے تو اس سے زیریں اور انفرادی سطح پر تو محنت و مشقت سے فرار اور حقائق سے گریز کا وہ رجحان پیدا ہوتا ہے جو۔

''مے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو
اِک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہئے''

کے مصداق نشہ آور چیزوں کے استعمال کی اصل غرض وغایت ہے۔ (یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم نے جوئے کو سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۱۹ اور سورۃ المائدۃ کی آیات ۹۰'۹۱ میں ''خمر'' یعنی شراب کے ساتھ بریکٹ کیا ہے!) اور معیشت کی اجتماعی اور بالائی سطح پر اشیائے صرف کی قیمتوں میں بے جواز اضافے اور ان میں اچانک کمی بیشی کے ذریعے منڈی کے عدمِ استحکام کے مہلک نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت نے ایک جانب جوئے' سٹے اور لاٹری کے قبیل کی جملہ چیزوں کو حرام مطلق قرار دیا اور دوسری جانب مستقبل کے سودوں کے ضمن میں سخت پابندیاں عائد کر دیں۔ چنانچہ بیع وشراء یعنی خرید وفروخت کی بہترین اور پسندیدہ صورت تو یہ قرار دی کہ صرف حاضر اور موجود مال کا سودا ہو تا کہ مبادلہ دست بدست ہو جائے' لیکن اگر کسی سماجی ضرورت کے تحت کوئی مستقبل کا سودا کیا جائے تو کل طے شدہ قیمت کا کوئی حصّہ یعنی دس یا بیس فیصد نہیں بلکہ کل کی کل قیمت فوری طور پر ادا کر دی جائے تا کہ سرمایہ کو اپنی اصل قدر اور مالیت سے زیادہ کا کاروبار کرنے یعنی Over trading کا موقع نہ مل سکے (اسے فقہ اسلامی

میں ''بیع سلم'' کہتے ہیں)۔

البتہ سود کی حرمت کا معاملہ ذرا زیادہ قابلِ غور ہے۔ اس کی حکمت و علت کو سورۃ الروم کی آیت ۳۹ میں حد درجہ اختصار اور غایت درجہ فصاحت و بلاغت کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے' یعنی یہ کہ اصل حقیقت کے اعتبار سے سود یا ربا یہ ہے کہ کسی شخص کا سرمایہ کسی دوسرے شخص کے مال میں نشو ونما پائے اور افزائش و افزودگی حاصل کرے۔ ﴿لِيَرْبُوَا فِىْ اَمْوَالِ النَّاسِ ﴾۔ اور یقیناً یہی سبب ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے سود کو ''زنا'' سے تعبیر فرمایا ہے۔ اس لئے کہ زنا کی صورت میں بھی مَرد کا نطفہ اپنی منکوحہ بیوی کی بجائے ناجائز طور پر کسی دوسری عورت کے رحم میں پرورش پاتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ایک شریف انسان زنا کا تو لفظ بھی زبان پر لانے سے ہچکچاتا ہے جبکہ سود کو عام طور پر ماں کے دودھ کے مانند مباح بنا لیا گیا ہے' حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ زنا کے بُرے اثرات زیادہ تر انفرادی یا معاشرے کی زیریں سطح تک محدود رہتے ہیں جبکہ سود کے ذریعے ''سرمایہ داری'' کی لعنت پورے معاشرے پر آکاس بیل کی طرح چھا جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضور ﷺ نے سود کو زنا سے سینکڑوں گنا زیادہ قبیح قرار دیا ہے۔ چنانچہ ابن ماجہ کی روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((اَلرِّبَا سَبْعُوْنَ جزْءً اَيْسَرُهَا اَنْ يَنْكِحَ الرَّجُلُ اُمَّهٗ)) (عن ابی ھریرۃؓ)

''ربا کے گناہ کے ستر حصے ہیں جن میں سے سب سے چھوٹا اور حقیر حصہ اس کے مساوی ہے کہ کوئی شخص اپنی ماں کے ساتھ بدکاری کرے!''

اور اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں سود پر اپنی اور اپنے رسول ﷺ کی جانب سے اعلانِ جنگ کی بایں الفاظ وعید سنائی ہے:

﴿فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ﴾ (البقرہ : ۲۷۹)

''اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اعلان جنگ سن لو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے''۔

اس معاملے کو سادہ ترین انداز میں یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے ذاتی سرمائے سے کاروبار کر رہا ہو اور اس میں محنت بھی یا صرف اس کی اپنی ہو یا

دوسرے انسانوں سے معین روزانہ اجرت یا ماہانہ تنخواہ کے عوض' تو اس معاملے میں نہ کوئی معاشی یا مالیاتی پیچیدگی ہے نہ شرعی قدغن۔ اسی طرح اگر بہت سے لوگ اپنا سرمایہ بھی جمع کرلیں اور سب مل جل کر کام بھی کریں اور نفع ونقصان میں شریک ہو جائیں تو یہ ''شراکت'' بھی ہر اعتبار سے حلال وطیب ہے اور اس کی اساس پر بڑے سے بڑے پیمانے پر تجارت اور صنعت کا کام کیا جا سکتا ہے۔ اصل مسئلہ وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں محنت کسی اور کی ہو اور سرمایہ کسی اور کا۔ چنانچہ اس معاملے میں اکبر الہٰ آبادی کے اس شعر کے مصداق کہ ؎

جہاں ہستی ہوئی محدود لاکھوں پیچ پڑتے ہیں
شریعت' عقل' منطق سب کے سب آپس میں لڑتے ہیں

ایسی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں جو اپنی ابتدائی صورت میں تو بڑی ''معصوم'' نظر آتی ہیں لیکن ان کے نتیجے میں معاشرے میں طبقاتی تقسیم پیدا ہو جاتی ہے اور ظلم' جبر اور استحصال کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔

ان پیچیدگیوں کے ضمن میں شریعتِ اسلامی کا اصل الاصول تو یہ ہے کہ اس کے نزدیک سرمایہ کو As such یعنی محض سرمائے کی حیثیت سے ''کماؤ'' یعنی Earning Agent تسلیم کیا جانا ''ناپسند'' ہے۔ چنانچہ اس کی ایک انتہائی صورت کو تو اس نے سود یا ربا قرار دے کر صرف حرامِ مطلق ہی نہیں بلکہ اتنا حرام قرار دیا ہے کہ سوائے شرک جلی کے کوئی اور عمل اتنا حرام نہیں ہے۔ اور ایک صورت کو سماجی ضرورت کے پیش نظر جائز قرار دیا ہے تو اس میں سرمائے کے لئے رسک کو اتنا بڑھا دیا ہے کہ محض منفعت کا طالب سرمایہ بھی اس کی جانب رخ ہی نہیں کرے گا۔

چنانچہ سود یا ربا تو یہ ہے کہ سرمایہ محض سرمائے کی حیثیت میں منفعت کا طالب ہو' نقصان کا رسک بالکل قبول نہ کرے اور منفعت بھی ایک معین شرح پر طلب کرے۔ یہ معاملہ خواہ نجی ضرورتوں کے سلسلے میں یعنی Usury کی صورت میں ہو' خواہ کسی تجارتی یا صنعتی معاملے میں' یعنی Commercial interest کی صورت میں ہو' یکساں

طور پر حرامِ مطلق، اپنی شناعت اور خباثت میں ماں کے ساتھ بدکاری سے سینکڑوں گنا زیادہ اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ جنگ کے مترادف ہے! اس لئے کہ اس صورت میں سرمایہ دار کا سرمایہ دوسرے لوگوں کے مال میں شامل ہو کر ان کی محنت اور مشقت کے طفیل افزائش اور افزودگی حاصل کرتا ہے اور اس طرح گویا پیسہ بغیر محنت اور نقصان کے رسک کے محض پیسے کی حیثیت سے پیسے کو کھینچتا چلا جاتا ہے جس سے ارتکازِ زر کی صورت پیدا ہوتی ہے اور دولت اور سرمایہ چند ہاتھوں میں جمع ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور اس کے نتیجے میں اجتماعی سطح پر تو معاشرے میں محبت اور اخوت کی بجائے نفرت وعداوت کا بازار گرم ہو جاتا ہے اور تعاضد اور تعاون کی بجائے کشاکش اور تصادم کی صورت پیدا ہو جاتی ہے اور انفرادی اعتبار سے سود خور انسان درندوں اور خون چوسنے والی چمگادڑوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ بقول علامہ اقبال۔

از ربا آخر چہ می زاید؟ فتن!
کس نداند لذتِ قرض حسن
از ربا جاں تیرہ، دل چوں خشت و سنگ
آدمی درندہ بے دندان و چنگ

یعنی "سود جیسی اُم الخبائث کے بطن سے آخر فتنوں کے سوا اور کیا چیز جنم لے سکتی ہے! افسوس کہ لوگوں کو قرضِ حسنہ (یعنی ایسا قرض جس میں صرف اصل زر ہی کی واپسی کا وعدہ ہو، بغیر کسی اضافے کے!) کی لذت کا احساس و ادراک حاصل نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ سود سے انسان کا باطن تاریک اور دل اینٹ پتھر کے مانند سخت ہو جاتا ہے اور انسان درندوں کی طرح کے پنجوں اور دانتوں کے بغیر فی الواقع درندہ بن جاتا ہے"۔

سرمایہ کے محض سرمائے کی حیثیت سے نفع کے مستحق ہونے کی جس صورت کو شریعت اسلامی نے بدرجہ آخر اور کراہت کے ساتھ (اس کی وضاحت بعد میں آئے گی) جائز قرار دیا ہے وہ "مضاربت" کا معاملہ ہے، جس میں سرمایہ کسی اور (ربّ المال) کا ہوتا ہے اور محنت کوئی اور (مضارب عامل) کرتا ہے۔ اس صورت میں اگر

نفع ہو تو وہ ان دونوں کے مابین پہلے سے طے شدہ شرح کے مطابق تقسیم ہو جاتا ہے۔ اس طرح گویا اس معاملے میں سرمایہ کو محض سرمائے کی حیثیت سے ''کماؤ'' (Earning agent) تسلیم کرلیا گیا ہے' لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ Master stroke بھی صرف حکمت الٰہی اور حکمتِ نبویؐ ہی کے لئے ممکن تھا کہ اس ''شر'' کی تلافی اس طرح کر دی گئی کہ اگر نقصان ہو جائے تو وہ سارے کا سارا ربّ المال یعنی سرمایہ دار برداشت کرے گا' مضارب عامل پر کسی قسم کے نقصان کی کوئی ذمہ داری یا تاوان عائد نہیں کیا جائے گا! لہٰذا سود خورانہ ذہنیت کے حامل شائیلاک اس صورت کی جانب کبھی رجوع ہی نہیں کر سکتے' بلکہ یہ صورت صرف ایسے لوگ ہی اختیار کر سکتے ہیں جن میں ذاتی جلب منفعت کے ساتھ ساتھ اور کم از کم اس کے مساوی اور برابر اپنے کسی بھائی کی مدد کا جذبہ بھی موجود ہو۔

مضاربت کے اصول پر کوئی شخص اپنا سرمایہ کسی دوسرے شخص (عامل) کے حوالے ظاہر ہے کہ صرف دو صورتوں میں کر سکتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ خود کام کرنے سے معذور ہو اور دوسرے یہ کہ وہ خود کسی اور کام جیسے ملازمت وغیرہ میں مشغول و مصروف ہو اور اس کے پاس ''بچت'' کی صورت میں کچھ فاضل سرمایہ جمع ہو جائے۔ پہلی صورت میں ایک غیور اور خود دار شخص لازماً یہ چاہے گا کہ بجائے اس کے کہ جو تھوڑی بہت پونجی اس کے پاس ہو اسے کھا کر ختم کر دے اور اس کے بعد ''یقینی'' طور پر زکوٰۃ و صدقات کے مستحق لوگوں میں شامل ہو جائے' کیوں نہ اپنی پونجی کو مضاربت کے اصول پر کسی قابل اعتماد شخص یا ادارے کے حوالے کر دے تاکہ اللہ کو منظور ہو تو اس کی گزر بسر زکوٰۃ و صدقات کے بغیر ہی ہوتی رہے۔ رہی دوسری صورت تو یہ فاضل سرمایہ ہی اصل میں اسلامی معاشیات کی وہ ''قدرِ زائد'' ہے جس کے ضمن میں اسلام کی ایمانی و احسانی اور فقہی و قانونی تعلیمات کو یکجا کر کے دیکھا جائے تو اس کے حامل کے سامنے چار راستے کھلے ہیں:

۱) بلند ترین تو یہ ہے کہ اس ''عفو'' کو غرباء اور مساکین کو دے کر خود فارغ اور سرخرو ہو جائے اور اپنے لئے روحانی ترفع کا سامان فراہم کر لے۔

۲) اس سے کمتر درجے میں یہ کہ اسے ''قرض حسن'' کی صورت میں اپنے کسی ایسے بھائی کو دے دے جو کام تو کر سکتا ہو لیکن سرمایہ سے محروم ہو' تا کہ وہ اس کے ذریعے اپنی معاشی گاڑی کو سٹارٹ کر کے اس کی اصل رقم بغیر کسی اضافے کے اسے لوٹا دے (یا اگر کوئی اضافہ کرے تو خالص اختیاری طور پر اپنی آزاد مرضی' بلکہ خواہش سے' یعنی بطورِ ہدیہ)

۳) اس سے بھی فروتر درجہ یہ ہے کہ وہ اپنی رقم مضاربت کے اصول پر کسی عامل کے حوالے کر دے' نقصان ہو تو پورا خود برداشت کرے اور اگر نفع ہو تو اس میں سے ایک حصّہ وصول کر لے۔ یہ جائز کی آخری حد ہے جو اوپر کی دونوں پسندیدہ اور مطلوبہ سطحوں سے فروتر ہونے کے باعث ان کے مقابلے میں ''مکروہ'' شمار ہوگی۔

۴) اور آخری اور بدترین اور اسفل ترین یہ ہے کہ یہ سرمایہ بغیر نقصان کا رسک لئے نفع کی معین شرح پر دوسروں کے حوالے کر دیا جائے ...... یہ سود اور ربا ہے ...... ماں کے ساتھ بدکاری سے سینکڑوں گنا زیادہ ...... اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے خلاف کھلا اعلانِ جنگ!